فرجام عشق

امام خمینی رح کی غزل پر ایک شرح

تالیف

سید عبداللہ فاطمی نیا

بسم الله الرحمن الرحيم

فرجام عشق

امام خمینیؒ کی غزل پر ایک شرح

مؤسسہ تنظیم و نشر آثار امام خمینی
بین الاقوامی امور

فرجام عشق

حضرت امام خمینی کی غزل پر ایک شرح

- مصنف :- سید عبداللہ فاطمی نیا
- ناشر :- مؤسسہ تنظیم ونشر آثار امام خمینیؒ - بین الاقوامی امور
- پتہ :- پوسٹ بکس نمبر ۶۱۳ / ۱۹۵۷۵ تہران - ایران
- ٹیلی فون :- ۵ - ۲۲۸۷۷۷۴ - ۲۲۸۳۱۳۸
- فیکس :- ۲۲۸۷۷۷۴
- چھاپ :- اول - ۱۹۹۸
- قیمت :- ۳۳۰ تومان

« فرجام عشق به زبان اردو »

فہرست

محترم قارئین سے ایک مختصر بات چیت ۱۳

مقدمہ ۱۹

شرح غزل

چشم بیمار

بیت اول

اصطلاحات اور مفرد الفاظ کی شرح ۳۱

عرفانی تفسیر ۳۳

لب کی تفسیر ۳۵

چشم بیمار کی تفسیر ۳۶

پہلی صورت ۳۶

شیخ الرئیس ابو علی سینا کی عبارت ۳۸

نتیجہ ۳۹
دوسری صورت ۴۰
نصیحت و تحذیر ۴۲
تیسری صورت ۴۳
تتمہ کلام ۴۴

بیت دوم

اصطلاحات اور مفرد الفاظ کی شرح ۴۵
عرفانی تفسیر ۴۹
شیخ الرئیس ابن سینا کی ایک قابل قدر عبارت ۵۰
ترجمہ و تشریح ۵۱
تبصرہ پر منحصر گفتگو ۵۱
پہلی بات ۵۳
دوسری بات ۵۴
اس مقام کے متعلق ایک عظیم راز ۵۶
تیسری بات ۵۷
پہلی توجیہ ۵۷
دوسری توجیہ ۵۹
ایک معقول اعتراض کا جواب ۶۰
عرفانی تفسیر اور نتیجہ ۶۰

قطعی اور آخری نتیجہ ۶۲
تحذیر پر مبنی گفتگو ۶۳

بیت سوم

اصطلاحات اور مفرد الفاظ کی شرح ۶۷
عرفانی تفسیر ۶۸
محبت کی اساس اور اس کے بنیادی سبب سے متعلق، پہلی بات ۶۹
شیخ الرئیس ابن سینا کی بات ۷۱
ایک عجیب حاشیہ ۷۱
اہلبیتؑ کی زبان سے محبّ اور محبۃ اللہ کی توصیف میں، دوسری بات ۷۶
نتیجہ ۷۸
عارف اور ادیب کے بارے میں ایک عجیب گوشہ ۷۹
دوسری تفسیر ۸۲
تبصرہ ۸۳
ایک عظیم اور اعلیٰ نکتہ ۸۳

بیت چہارم

عرفانی تفسیر پر تمہید ۸۵
تفسیر عرفانی ۹۰
شعر کے تفسیر کی دوسری تعبیر ۹۱
"مدرسہ سے بیزاری" کے بارے میں ایک اور مستقل تفسیر ۹۳

معارف تک پہنچنے کے بارے میں دو طرح کے نظریات ۹۶
دوسرے نظریہ کے حامل افراد کی گفتگو کا مدعیٰ ۹۸
جواب ۱۰۲
ایک نہایت باریک نکتہ ۱۰۴
برہان سے کشف کی عدم مخالفت کے سلسلے میں صدر المتالہین کی گفتگو ۱۰۷
ایک ممکنہ سوال ۱۰۹
جواب ۱۱۱
حکیم لاہیجی کی ایک اور قابل غور گفتگو ۱۱۶
اس سلسلے میں بعض آیتوں اور بعض روایتوں ۱۲۶
تیسری حدیث کی توضیح ۱۳۱
آخری نتیجہ ۱۳۳

بیت پنجم

شرح اصطلاحات اور مفرد الفاظ کی توضیح ۱۳۷
عرفانی تفسیر ۱۳۸
نتیجہ ۱۳۹
"ہوشیار شدن" کے بارے میں امام صادقؑ کا ایک عجیب مفہوم ۱۴۰
مفید عام اختتام ۱۴۳

بیت ششم

اصطلاحات اور مفرد الفاظ کی شرح ۱۴۵

عرفانی تفسیر ۱۴۷
نتیجہ ۱۴۸

بیت ہفتم

اصطلاحات اور مفرد الفاظ کی شرح ۱۴۹
عرفانی تفسیر ۱۵۰
بنیادی عرفانی تفسیر ۱۵۱
صاحب فتوحات کی بات ۱۵۴
شیخ کی گفتگو میں ایک اہم بنیادی بات ۱۵۶
نتیجہ اور اختتامی تفسیر ۱۶۶

تمّ

والحمدللہ

محترم قارئین سے ایک مختصر بات چیت

یہاں میں اپنے محترم پڑھنے والوں کو چند نکتوں کی طرف توجہ دلانا چاہتا ہوں :

۱ــــــ یہ مختصر کتاب ان لوگوں کے لئے مدون ہوئی ہے جن کی زبان فارسی ہے اور اس میں ایسے علمی اور عرفانی مطالب کو سمویا گیا ہے جس کے بارے میں ہمارے محترم قارئین کسی قدر الجھاؤ کا شکار ہیں۔

۲ــــــ کتاب میں بعض مقامات ایسے بھی ہیں کہ جہاں بات عربی میں کہی گئی ہے اور اس کا ترجمہ پیش نہیں ہوا ہے۔ میں اس

کی وجہ مکمل طور پر عرض نہیں کروں گا۔ ہاں اس تفصیل کی، اجمال بیان کرتے ہوئے عرض کروں گا کہ خالی تحت اللفظ ترجمہ سے ان کا حق ادا نہیں ہوتا اور ہمارے وہ دوست کہ جو علماء اور فضلاء کی کتابوں کو اس طرح ترجمہ کرتے ہیں میں ان کا مقصد آج تک سمجھ نہ سکا۔ کیا وہ اُن اہلِ علم و فن کے لئے اس طرح کا تحت اللفظ ترجمہ کرتے ہیں کہ جو اس کتاب کے فن سے واقف ہوتے ہیں اور جنھیں ترجمہ کی ضرورت نہیں ہوتی؟ یا پھر وہ ان لوگوں کے لئے یہ زحمت جھیلتے ہیں۔ جنھیں فنِّ عرفان میں کمال دخل ہوتا ہے لیکن عربی سے انھیں واقفیت نہیں ہوتی۔ لیکن یہ فرضیہ بھی اس موضوع کے لئے جملہ منفیہ ہے اس لئے کہ نظری عرفان سے متعلق بیشتر کتابیں عربی زبان میں لکھی گئی ہیں اور جب تک کسی نے عربی ادبیات کو خوب اچھی طرح نہ پڑھ لیا ہو وہ اس سے استفادہ نہیں کر سکتا۔ پس کیوں کہ کوئی عرفانِ نظری میں متبحّر ہے اور عربی بھی نہیں جانتا؟ شاید استثنائی طور پر ایسا ممکن ہو اور کوئی نادر مثال سامنے آئے؛ "والنادر کالمعدوم"

اس طرح کے امور، خام اندیشیوں کو عام ذہنوں میں جنم دیتے ہیں اور لوگ یہ سمجھنے لگتے ہیں کہ علمی کتب کی مشکل اس کا عربی ہونا ہے اور ایک عالم کا ہنر اس کی عربی سے واقفیت

ہے اور یہ بالکل ایسا ہی ہے جیسے ہم ایک ماہر قلب ڈاکٹر کے بارے میں کہ جس کی مطالعہ سے متعلق کتابیں انگریزی میں تحریر ہیں یہ کہیں کہ اس نے کون سا کارنامہ انجام دیا ہے ؟ اس کا ہنر صرف انگریزی زبان سے واقفیت ہے ؛ کیا اس طرح کی گفتگو تعجب خیز نہیں ہے ؟ حالانکہ مذہبی عالم نے عربی زبان کو اسلامی علوم کے سیکھنے کا راستہ قرار دیا ہے اور یہ عربی زبان اس کے لئے طریقیت رکھتا ہے۔ موضوعیت نہیں ؛ اسی طرح اس ڈاکٹر نے بھی انگریزی یا فرانسیسی زبان کو علم و دانش کے حصول کا ذریعہ بنایا ہے۔ علمی کتابوں کی مشکل اس کا عربی یا انگریزی ہونا نہیں ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو لوگ کچھ افراد کو اس بات پر مامور کرتے کہ وہ تمام (اسلامی یا غیر اسلامی) علمی کتابوں کا ترجمہ کریں تاکہ ہر کوئی گھر بیٹھے تحقیق اور مطالعہ میں سرگرم عمل ہو اور قدم بہ قدم ہر جگہ آپ کو عمدۃ المحققین چلتے پھرتے نظر آئیں گے اور علمی مراکز اور یونیورسٹیوں کا تختہ ہو۔

پس میرے عزیز دوستو جہاں کہیں بھی آپ کو ایسی عبارت ملے جس کا ترجمہ نہ ہوا ہو آپ اس کو میری بھول پر محمول نہ کریں، تاہم اس کے علاوہ بھی کچھ اور مصلحتیں تھیں کہ جنھیں بیان کرکے میں آپ کا وقت لینا نہیں چاہتا مگر یہ کہنا ضروری سمجھتا ہوں کہ اس کتاب میں ان لوگوں کے لئے کافی حد تک سوچنے سمجھنے

کے مواقع ہیں جن کی زبان فارسی ہے اور وہ چند ترجمہ میں نہ آنے والے مقامات بہت کم اور بہت مختصر ہیں۔

۳ــــ میں نے پیش لفظ کے آغاز ہی میں اپنے نقصِ کمال کا اعتراف کیا ہے "وما الکمال الا الذی القدرۃ والجلال" تاہم حتّی المقدور کوشش کی ہے کہ میری گفتگو مستند بنیادوں پر اسناد و مدارک کے حوالوں کے ساتھ مستحکم اور مستقر ہوں۔

۴ــــ ابیات کی عرفانی تفسیر میں، میں نے ان اصطلاحات سے کام لیا ہے کہ جو عرفاء کے درمیان مشہور اور مروّج ہیں۔ لیکن حضرت امام کے عرفان سے متعلق اشعار کو میں اس سے کہیں بلند سمجھتا ہوں کہ انہیں صرف مروّجہ اصطلاحات کے دائرہ میں تفسیر کے مرحلے سے گزارا جائے لہٰذا آپ ملاحظہ فرمائیں گے کہ میں نے مروّجہ اصطلاحات کے علاوہ اس عظیم الشان ہستی کی غزلیات کے لئے دوسری تفسیریں بھی بیان کی ہیں۔ اس نکتہ کا تذکرہ ہمارے کرم فرماؤں کے لئے بڑا اہم ہے کہ، ان مقامات پر زیادہ توجہ فرمائیں کہ جہاں تفسیر کا تمہیدی رابطہ، خود تفسیر سے قدرے خفی ہو۔ "العاقل تکفیہ الاشارۃ"

آخر میں مَیں "من لم یشکر المخلوق لم یشکر الخالق" کے پیشِ نظر یہ ضروری سمجھتا ہوں کہ امامِ عزیز کی نشانی حضرت

حجۃ الاسلام والمسلمین جناب آقای حاج سید احمد خمینی ادام اللہ ایام عزہ کے حضور اپنے قلبی تشکر کو پیش کروں کہ جنھوں نے اس اعلیٰ ترین قیمتی تحفہ یعنی امام کے اس آخری غزل یا "آخری نالۂ عشق" کو ایران کی محترم اور مسلمان قوم کی خدمت میں پیش کیا۔

جزاہ اللہ خیر جزاء المحسنین

تہران ۔ سید عبداللہ فاطمی نیا

۹ مرداد ۱۳۶۸ شمسی مطابق ۲۷ ذالحجۃ الحرام ۱۴۰۹ھ

مقدّمہ

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

رندانِ تشنہ لب را جامی نمی دھد کس
گوئی ولی شناسان رفتند ازاین ولایت

" العلم نقطۃ کثرھا الجاھلون"

اس کلام کو حضرت مولی الکونین امیرالمومنین علی صلوٰت اللہ علیہ سے نسبت دی جاتی ہے یعنی : علم ایک نقطہ ہے جسے نادانوں نے پھیلا دیا ہے۔

نادان بات نہیں سمجھتا اور نقطہ کو دَوْرخ سے بڑھا دیتا ہے۔

پہلے :

وہ صحیح اور درست مفہوم کے اطراف مثبت یا منفی باتیں تراشتا ہے اور اسے علم سے نسبت دے کر کثرت کو وجود میں لاتا ہے جس کے نتیجہ میں علم کا نقطہ ان باتوں کی بھیڑ میں گم ہو جاتا ہے یا وہ دوسرے نادان کہ جو اسے دانا سمجھتے ہیں اس کی گھڑی گھڑائی باتوں سے اور دوسری باتیں اخذ کر کے قیل و قال کی ایک کثرت کو جنم دیتے ہیں۔

دوسرے :

نادان اس بات کا سبب بنتا ہے کہ باخبر لوگ اس کی باطل گفتگو کو رد کرنے کے لئے کچھ نہ کچھ عرضِ مدّعا کریں جسے سادہ لفظوں میں یوں کہنا چاہیئے کہ : نادان انسان سے بات اگلواتا ہے، اور شاید یہ مفہوم بھی " کثرھا الجاھلون " کے مفاہیم سے ایک ہو۔

بہرحال ان اوراق کے لکھنے والے اور اس جاہل علی الاطلاق نے کبھی بھی علم و فہم کا دعویٰ نہیں کیا؛ البتہ " واما بنعمۃ ربّك فحدّث " کی رو سے میں صرف اتنا عرض کروں گا کہ : میں خداوندِ کریم اور بلند و برتر کا شکر بجالاتا ہوں کہ میری نسبت جاہلوں کے اس گروہ سے نہیں ہے کہ جو حضرت سیّد الفقہا امام خمینی۔ نوّر اللہ تربتہ الشریفہ۔ جیسی دُنیا کی عظیم ہستیوں کے اشعار اور اُن

کی غزلوں میں "بت"، "مے"، "میکدہ"، "خال" اور ان جیسے الفاظ دیکھ کر انھیں لغوی اور حقیقی مفاہیم پر محمول کرتا ہے۔

اس سلسلے میں کہ اہلِ عرفان کی ایک خاص زبان اور کچھ مخصوص اصطلاحیں ہوتی ہیں ہم نے اس کتاب کے متن میں مختصر طور پر خامہ فرسائی کی ہے اگرچہ پہلے میرا خیال تھا کہ میں اس موضوع پر مبسوط گفتگو کروں مگر بعد میں جب میں اس مقدمہ کو لکھنے اور اس کے مطالب کی تنظیم و ترتیب کے بارے میں سوچ رہا تھا تو میرے ایک اہلِ علم کرم فرما نے مجھے یہ بات بتائی کہ جو باتیں میں اس سلسلے میں لکھنا چاہتا ہوں وہ سب کچھ "خدماتِ متقابل اسلام و ایران" نامی کتاب میں آچکی ہے، جب میں نے اس کتاب کا مطالعہ کیا تو میں نے دیکھا کہ (کثرھا الجاھلون کی دوسری تفسیر کے مطابق) ایک بے خبر اور ناآگاہ فاضل اس بات کا سبب بنا کہ اُستاد شہید آیت اللہ مطہری۔ عطر اللہ مرقدہ۔ اہلِ عرفان کی اصطلاحوں اور "میکدہ" "بتکدہ" "خال" اور اس طرح کے باقی ان الفاظ پر ایک جامع اور سیر حاصل گفتگو کریں جو اسلامی دُنیا میں تمام غزل سَراؤں کی زبان پر جاری ہوتے ہیں اور الحق کہ انھوں نے اس سلسلے میں بڑی داد سخن دی ہے[1]۔

---

[1]: ملاحظہ فرمائیے صفحہ ۲۶۵ تا ۲۷۷ (مطبوعہ صدرا ۱۳۵۹ شمسی)

وہ اہم نکتہ کہ جو اُستاد شہید کی بحث میں پایا جاتا ہے یہ ہے کہ اس عالمِ ربّانی نے "شراب" "پیمانہ" اور اس طرح کے بعض الفاظ کے استعمال کے سلسلے میں قرآن اور نہج البلاغہ تک سے دلیلیں فراہم کی ہیں۔

اُستادِ شہید کی اس بحث کے مطالعہ اور اس کے بغور جائزہ کے بعد میں نے دیکھا کہ اس سلسلے میں اب مزید کسی گفتگو کی گنجائش نہیں ہے، اور انہی کہی ہوئی باتوں کو مزید دہرانے سے کچھ حاصل نہیں اس لئے میں نے صرف کتاب کے حوالے پر اکتفاء کرکے اپنے محترم پڑھنے والوں کو اس کی طرف متوجہ کیا۔

جیساکہ میں پہلے عرض کرچکا ہوں اُستاد کی گفتگو بڑی جامع اور کامل ہے لیکن یہ حقیر اُستاد کی گفتگو میں زیادہ اکمال کے لئے اور کچھ اور مصلحتوں کے پیشِ نظر اسلام کی تین نامور ہستیوں کے ان اشعار کو بطور نمونہ پیش کرتا ہے جن میں انھوں نے "مئے" "جام" اور "پیمانہ" جیسے الفاظ کو استعمال کیا ہے۔ ان تین ہستیوں میں سے دو کا شمار قدماء میں ہوتا ہے جب کہ ایک کا تعلق مُتأخّرین سے ہے:

الف : ان میں پہلی شخصیت عظیم شیعہ عالم سیّد اجل علامّہ علی بن الحسین الموسوی کی ہے کہ جن کو لوگ "مُرتضیٰ" کے نام سے جانتے ہیں اور جن کا لقب "علم الھدیٰ" اور سنہ وفات ۴۳۶ھ ہجری

قمری ہے اور جو "الشافی" "الانتصار" "تنزیہ الانبیا" اور ان جیسی دیگر گرانقدر کتابوں کے مؤلف ہیں اور علوم و فنون اور ادب میں ان کا مرتبہ کسی تعریف و توصیف کا محتاج نہیں، وہ کہتے ہیں:

یَا مَلِیحَ الْوَجْهِ لِمْ فِعْلُكِ لِی غَیْرُ مَلِیحِ؟

إِنَّ مَنْ یَبْذُلُ نَفْسًا فِی الْهَوَیٰ غَیْرُ شَحِیحِ

وَالْهَوَیٰ بَلْوَیٰ وَلٰکِنْ لِسَقِیمٍ بِصَحِیحِ

«کَمْ لَیَالٍ سَهَرِی فِیكِ غَبُوقِی وَصَبُوحِی»[1]

ب۔ دوسری شخصیت میں آپ ہی کے نامور بھائی علامہ ادیب اور عظیم شیعہ شاعر سیّد اجل جناب محمد بن الحسین الموسوی ہیں کہ جنھیں لوگ "سیّد رضی" یا "شریف رضی" کے نام سے جانتے ہیں اور جن کی سنہ وفات ۴۰۶ ہجری قمری ہے اور یہی وہ قابلِ فخر ہستی ہیں کہ جنھوں نے "نہج البلاغہ" جیسی نورانی کتاب کو مرتّب کیا اور "المجازات النبویّہ" "تلخیص البیان فی مجازات القرآن" "حقائق التأویل" اور "خصائص الائمہ علیہم السّلام" جیسی عظیم الشان کتابیں تالیف کیں جن میں "حقائق التأویل" قرآن کی وہ تفسیر ہے کہ جس کے بارے میں بعض علماء اہلِ سنت نے یہ کہا ہے کہ اس جیسی کتاب کا لکھنا ایک انتہائی مشکل اور کٹھن کام ہے۔ غرض یہ کہ علوم و فنون اور ادب میں اس

۱۔ دیوان ط مصر، جلد ۱ ص ۲۰۵

ہستی کی معلومات اظہر من الشمس ہے اور اس میں زیادہ گفتگو کی گنجائش نہیں ہے۔

علامہ رضی فرماتے ہیں:

عَلیٰ حینَ مٰا جٰادَ الزَّمٰانُ بِمُسْعِدِ
جَلَوْنٰا عَلَیْهِ الْخَمْرَ حَتّیٰ تَکَشَّفَتْ
فَوٰاقِعُهٰا عَنْ لَوْنِهَا الْمُتَوَرِّدِ
نَفُضُّ لَنٰا عَنْهٰا حَبٰاباً کَأَنَّهُ
قَذیً یَتَمَشّیٰ بَیْنَ اَجْفٰانِ اَرْمَدِ
وَ نَدْمٰانِ صِدْقٍ تَسْلُبُ الرّٰاحُ عَقْلَهُ
وَ تَسْلُبُهٰا خَدّٰاهُ حُسْنَ التَّوَرُّدِ
فَلٰا زٰالَتِ الأَیّٰامُ تَجْری صُرُوفُهٰا
عَلَیْنٰا بِمَغْبُوطٍ مِنَ العیش سَرْمَدِ(۳)

نیز کہتے ہیں:

اسقِنی فَالْیَوْمُ نَشْوٰانُ — و الرُّبیٰ صٰادٍ وَرَیّٰانُ
کَفَلَتْ بِاللَّهْوِ وٰافِیَةً — لَکَ نٰایٰاتٌ وَعیدانُ
حازَ وَفْدَ الرّیحِ فَالْتَطَمَتْ — مِنْهُ اَوْراقٌ وَاَغْصٰانُ
کُلُّ فَرْعٍ مٰالَ جٰانِبُهُ — فَکَأَنَّ الأَصْلَ سَکْرٰانُ

یہاں تک کہ ارشاد ہوتا ہے:

۱۔ دیوان ط بیروت، ۱/۳۹۳

فَاسْقِنِی فَالْوَصْلُ یِأْلَفُنِی إِنَّ یَوْمَ الْبَیْنِ قَرْحَانُ
قَهْوَةً مَازَالَ یَقْلَقُ مِنْ مُجْتَنَاهَا الْمِسْكُ وَالْبَانُ [1]

ج : اوراب یہ تیسری ہستی، متاخرین میں دنیائے شیعیت کی وہ عظیم ہستی ہے کہ جو سیّد رضا ہندی (مرحوم) کے نام سے مشہور ہے اور علاّمہ اور فقیہ کے درجہ پر فائز ہونے کے ساتھ انہیں ایک بلند پایہ ادیب ہونے کا فخر بھی حاصل ہے۔ ۱۳۶۲ ہجری اُن کی سنہ وفات ہے اور یہ وہ عظیم ہستی ہیں کہ جنھوں نے سیّد محمد طبا طبائی، شیخ محمد طٰہ نجف، صاحبِ جواہر کے فرزند شیخ حسن، شربیانی، آخوند خراسانی، اپنے والدِ بزرگوار اور سیّد محمد جیسے اعاظم علماء سے تحصیلِ علم کیا اور مدارجِ عالیہ تک پہنچے۔ سیّد کی شعرو ادب پر دسترس ایک انتہائی اہم موضوع ہے کہ جس پر گفتگو کے لئے ایک علیحٰدہ کتاب کی ضرورت ہے۔ سیّد نے جناب امیرالمؤمنین صلواۃ اللہ علیہ وعلی اولادہ الطاہرین کی مدح میں ایک قصیدہ، ”کوثریہ“ کے نام سے لکھا ہے کہ اگر ہم اسے ایک بے مثل اور بے نظیر قصیدہ کہیں تو ہرگز اس میں اغراق نہیں ہے۔ ہم یہاں

۱۔ دیوان ط بیروت ۲۰/ ۵۰۳، ۵۰۵۔ عظیم شیعہ لغت داں ابن سکیت ؒ نے تہذیب الالفاظ کی کتاب (ط المطبعۃ الکاثولیکیۃ ۱۸۹۵ء) ص ۲۱۱ میں قہوہ کو شراب کے ناموں میں گنا ہے۔

اسی قصیدہ کے چند ابیات کو اپنی گفتگو کی دلیل میں اور نیز تبرکاً اور تیمناً پیش کرتے ہیں:

امفلّج ثغرک ام جوهر و رحیق رضابك ام سکّر
قد قال لثغرک صانعه (انّا اعطیناك الكوثر)
و الخال بخدّک ام مسکٌ نقّطت به الورد الأحمر
ام ذاک الخال بذاک الخدّ فتیت النّدّ علی مجمر
عجباً من جمرته تذکو و بها لایحترق العنبر
یا من تبد ولی وفرته فی صبح محیّاه الأزهر
فاجنّ به اللیل اذا یغشی و الصبح اذا اسفر
ارحم ارقاً لولم یمرض نبعاس جفونک لم یسهر

یہاں تک کہ ارشاد ہوتا ہے:

فاجل الاقداح بصرف الر اح عسی الأفراح بها تُنشر
و اشغل یمناک بصبّ الکا س و خلّ یسارک للمزهر
فدم العنقود و لحن العود یعید الخیر و ینفی الشّرّ
بکّر للسکر قبیل الفجر فصفو الدهر لمن بکّر

اور اب بات اس منزل تک پہنچتی ہے:

هل یمنعنی و هو السّاقی ان اشرب من حوض الکوثر؟
أم یطردنی عن مائدة وضعت للقانع و المعترّ

يا من انكر من آيات ... ابى حسن ما لم ينكر
ان كنت لجهلك بالأيام ... جحدت مقام ابى شبرّ
فاسأل بدراً و اسأل أحداً ... و سل الأحزاب و سل خيبر
من دبّر فيها الأمر و من ... اردى الأبطال و من دمّر؟
من قدّمه طه و على ... اهل الإيمان له امّر؟
قاسوكَ ابا حسن بسواك ... و هل بالطّوديقاس الذّر؟
من غيرك من يدعى للحر ... ب و للمحراب و للمنبر؟
افعال الخير اذا انتشرت ... فى النّاس فانت لها مصدر
و اذا ذكر المعروف فما ... لسواك به شيئ يذكر
فاصدع بالأمر فناصرك ... البتّار و شانئك الأبتر
انت المهتمّ بحفظ الدين ... و غيرك بالدنيا يغترّ
آيات جلالك لاتحصى ... و صفات كما لك لا تحصر
من طوّل فيك مدائحه ... عن ادنى واجبها قصّر
فاقبل يا كعبة آمالى ... من هدى مديحى ما استيسر

شرح غزل

چشم بیمار

خال لب کا ترے اے دوست گرفتار ہوں میں
چشم بیمار کو دیکھا ہے تو بیمار ہوں میں

کوس انا الحق کا بجایا ہے کہ مثل منصور
اتنا بیخود ہوں، خریدار سردار ہوں میں

غم دلدار نے بھر دی وہ مری روح میں آگ
جاں سے بیزار ہوں اور شہرۂ بازار ہوں میں

وا رہے میرے لیے میکدہ کا در شب و روز
مسجد و مدرسہ دونوں ہی سے بیزار ہوں میں

جامہ زہد و ریا پھینک دیا اور پہنا
خرقہ پیر خرابات تو ہشیار ہوں میں

واعظ شہر کی باتوں نے ستایا جو مجھے
رند میخوار کا اب ہمدم و ہمکار ہوں میں

یاد بت خانہ کروں اب، کہ بت میکدہ نے
خواب سے مجھ کو جگایا ہے تو بیدار ہوں میں

قال سیّدالاعاظم: قدس اللہ لطیفہ واجزل تشریفہ

من بہ خال لبت ای دوست گرفتار شدم
چشم بیمار تو را دیدم و بیمار شدم

اصطلاحات اور مفرد الفاظ کی شرح (*)

"خال" اور "لب" لغوی اعتبار سے جانے پہچانے الفاظ ہیں۔ فارسی، (اُردو) ادب اور شعر کے کلام میں ان کا استعمال بیحد

---

* - شعری اصطلاح اور ادبی شرح کو ہم نے پوری کتاب میں عرفانی تفسیر سے الگ بیان کیا ہے۔

وحصر ہوا ہے۔ لہٰذا ہم نے اس سلسلے میں مزید وضاحت اور مثالوں سے گریز کیا ہے۔

"چشم بیمار"، وہ نیم بستہ خمار آلود آنکھیں ہیں کہ جو محبوب کے حسن و جمال کو دو بالا کرتیں ہیں۔

یہ اصطلاح بھی فارسی (اور اُردو) شاعری میں ایک طویل عرصے سے زبان زد شعرا ہے اور بڑی کثرت سے استعمال میں آتا رہا ہے چنانچہ حافظ کہتے ہیں:

کمان ابروی مارا مزن تیر
کہ پیش چشم بیمارت بمیرم[1]

اور اسی طرح ان کا یہ شعر[2]

شکر چشم تو چہ گویم کہ بدان بیماری
میکند درد مرا از رُخِ زیبای تو خوش

---

[1]: ہم نے اس بیت کو قدسی کے نسخہ سے نقل کیا ہے وگرنہ پژمان کے چھپے ہوئے حافظ میں دوسرا مصرع بدلا ہوا ہے اور وہ یوں ہے۔

"کہ پیش دست و بازویت بمیرم"

[2]: حافظ مطبوعہ پژمان غزل ۳۹۹

عرفانی تفسیر

تھانوی "خال" کی تفسیر میں کہتے ہیں: اہلِ سلوک کی اصطلاح میں یہ لفظ من حیث الخفا نقطۂ وحدت کی طرف اشارہ ہے کہ جو مبدٔ و منتہای کثرت ہے: "منه بدء و الیه یرجع الامر کله" اس لئے کہ خال سیاہی کے سبب ہویت غیبیہ کے مشابہ ہے کہ جسے ادراک و شعور کی بلندی بھی پا نہیں سکتی اور جو تمام ذہنی قوتوں سے مستور و مخفی ہے "لا یری اللہ الا اللہ ولا یعرف اللہ الا اللہ" اور یہ بھی کہا جاتا ہے کہ خال، وجودِ محمدی یعنی ہستی عالم سے عبارت ہے[1]

راقم یہ چند سطور پیش کرتا ہے: عالی مرتبت حکیم اور بلند پایہ عارف ملا علی نوری صدرا لحکماء رضوان اللہ تعالےٰ کی تفسیر پر اپنے حاشیہ میں لکھتے ہیں:

«إنّ الرحمة الوجوديّة لهى الرّحمة الرحمانيّة المسمّاة بالنّفس الرحماني و بالوجود المطلق و الفيض المقدّس و بالمشيّة الّتى خلقت بنفسها و هى الحقيقة المحمديّة فى وجه. و تقيّد بالوجوديّة تفرقة بينها

---

[1]: کشاف ط کلکتہ ۱/۴۵۱

و بين الرّحمة الرّحيميّة المسّماة بالرّحمة المكتوبة على نفسه سبحانه المسّماة بأمّ الكتاب و اللوح المحفوظ الذى كتب القلم الأعلى المحمدى فيه كل ما كان ومايكون الى يوم القيامة وهى العلوية العليا. »

اشارة فيها انارة خذ هاوكن من الشّاكرين

اگر کوئی خداوندِ تبارک و تعالیٰ کی، قانون شریعت کی پاسداری حضرت امام الموحدین کے ارشاد عالیہ "و مشیهم التواضع" کے عام مفہوم میں۔ سلوکِ مسلکِ تواضع، کسبِ صفاتِ عالیہ کہ جس کے بغیر کسی منزل تک پہونچنا ناممکن ہے، عبادات کی بجاآوری اس انداز کے ساتھ کہ جس سے محبّت ٹپکتی ہو یعنی ایسی عبادت کہ جو حق سبحانہ تعالےٰ کی محبّت کا مظہر ہو، اور تہذیبِ نفس کیساتھ مقامِ "قربِ نوافل" تک پہنچے کہ جس کی شرح انشاء اللہ آگے چل کر سامنے آئے گی۔ تو اس صورت میں باذن اللہ تعالےٰ اگر صلاح ہوئی تو قلبِ عالم ارواحنا فداہ کے مناجات کا استماع اس کے لئے ممکن ہوگا اور چونکہ اس مقام تک رسائی اہلِ بیت صلوٰت اللہ علیہم کی ولایت کے بغیر ممکن نہیں بلکہ اس سے اجتناب دوری کا سبب ہوتی ہے

از رھگذرِ خاکِ سرِ کوئی شما بود
ہر نافہ کہ در دستِ نسیمِ سحر افتاد

اس لئے "من شئنا*" کا جملہ اس کے حقیقتِ حال ہوگا۔ زیارت "آلِ یٰسین" میں "السّلام علیك حین تصلی و تقنت، السّلام علیك حین ترکع وتسجد، السّلام علیك حین تُھلّل وتکبّر۔ السّلام علیك حین تحمد وتستغفر" کے جملے اس لئے آئے ہیں تاکہ ان نورانی کلمات کے مفہوم کو اُس نازنیں ہونٹوں کے خال کا نام دیا جائے۔ البتہ جیسا کہ گزشتہ عبارات سے آپ نے اندازہ لگایا یہ مرحلہ اسی وقت رونما ہوتا ہے جب پڑھنے والا صرف زیارت کے پڑھنے پر اکتفا نہ کرے بلکہ ان مذکورہ تمہیدی شرائط کے ساتھ اندھیرے اور سیاہی سے باہر نکلے اور جملے اس کی نظر میں سفید اور روشن دکھائی دیں۔ رزقنا اللہ تعالےٰ ھذا المقام انہ جواد کریم۔

لبِ کی تفسیر

صاحب کشاف کہتے ہیں لب، محبوب کے کلام سے عبارت ہے اور لبِ لعل، معشوق کے کلام کے بطن کو کہا جاتا ہے۔

---

* ۔ اس حدیث کی طرف اشارہ ہے جس میں کہا گیا ہے کہ ائمہ اطہارؑ میں سے بعض ہستیوں سے پوچھا گیا کہ کون ایسے لوگ ہیں جو آپکے اسرار سے واقف ہیں تو آپ نے (اس مفہوم پر مبنی جملہ ارشاد) فرمایا: "من شئنا" جن کو ہم چاہیں۔ (پس غور کرو اور اپنا جائزہ لو)

چشمِ بیمار کی تفسیر

اس لفظ کی تفسیر کو تین صورتوں میں پیش کیا جاسکتا ہے:

پہلی صورت

یہ چشمِ بیمار عارف کے ان مشاہدات اور مکاشفات کی طرف ایک اشارہ ہوسکتا ہے جو انواری مراحل میں حقِ سبحانہ تعالےٰ کی طرف سے اسپر متجلی ہوتی ہیں اور "وصل و قطع" کی صورت میں بعض عوالم اسے دکھائے جاتے ہیں، اس منزل پر میں سیّد العارفین، امام الموحدین امیر المومنین صلوٰت اللہ علیہ کی ایک عبارت کا تذکرہ ضروری سمجھتا ہوں کہ جس کے بغیر یہ اہم موضوع ذہنوں میں راسخ نہیں ہوگا۔

قال علیہ السلام

«قَدْ اَحْیٰا عَقْلَهُ، وَ اَمَاتَ نَفْسَهُ، حتّی دَقَّ جَلیلُهُ، وَ لَطُفَ غَلیظُهُ، وَ بَرَقَ لَهُ لٰا مِعٌ کَثیرُ الْبَرْقِ. فَاَبٰانَ لَهُ الطَّریقَ، وسَلَکَ بِهِ السَّبیلَ، وَ تَدافَعَتْهُ الْأبوابُ اِلیٰ بٰابِ السَّلٰامَةِ، وَ دارِ الإقٰامَةِ، وَ ثَبَتَتْ رِجْلاٰهُ

بِطُمَأْنِينَةِ بَدَنِهِ فِي قَرَارِ الأَمْنِ وَ الرَّاحَةِ، بِمَا استَعْمَلَ قَلْبَهُ، وَ أَرْضَىٰ رَبَّهُ.»

ترجمہ

بتحقیق "سالک" نے زندہ کیا اپنی عقل کو اور مارا اپنے نفس کو یہاں تک کہ اس کا جسم لاغر و نحیف ہوگیا اور اسکی ناہمواریوں میں لطافت آگئی اور ایک (روشن و تابناک) نور کہ جس کی تابش بہت زیادہ (اور مکرر) تھی اس پر چمکنے لگی اور راستہ کو اس کے لئے روشن و آشکار کیا اور اس راستے پر اس کی دستگیری کی اور اسے آگے بڑھا اور (ریاضت و سلوک سے متعلق) اس کے ابواب کو بابِ سلامت اور دارِ اقامت کی سمت لے گیا اور مکمل جسمانی سکون کے ساتھ مقام مقررہ پر مستقر ہوا

حقیقتِ امر یہ ہے کہ سالک کے حقیقت سلوک، اس کے احوال و ادوار و امور اور اس کے کام کے آغاز و انجام کی توصیف میں اس کلام سے زیادہ اجلّ و اعلیٰ اور بلند و بالا کلام آپ کو اور کہیں نہیں ملے گا۔ ابنِ ابی الحدید معتزلی کہتا ہے:

فن عرفان کے اکابرین نے جو کچھ بھی اس سلسلے میں کہا ہے وہ سب انھوں نے جناب امیر المومنین سلام اللہ علیہ ہی سے لیا

لہ: شرح نہج البلاغہ ابن ابی الحدید ١١/ ١٣٧

ہے۔ وہ کہتا ہے شیخ ابو علی سینا اور قشیری کے تمام فرمودات جو انھوں نے اس (وصفِ سلوک و سالک کے) سلسلے میں کہے ہیں وہ سب جناب امیر علیہ السّلام کے ارشادات ہی کے نقش ہیں۔

شیخ الرئیس ابو علی سینا کی عبارت

«ثمّ إنّه اذا بلغت به الارادة حدّاً ما. عنّت له خلسات من اطلاع نورالحقّ علیه لذیذة کأنّها بروق تومض الیه ثمّ تخمد عنه. و هوالمسمّی عندهم اوقاتاً. و کلّ وقت یکتنفه وجدان: وجد الیه و وجد علیه. ثمّ إنّه لتکثر علیه هذه الغواشی اذا امعن فی الارتیاض» [1]

ترجمہ

اس کے بعد[2] جب سالک "ارادہ"[3] میں کسی حد تک پہنچ جاتا ہے تو نورِ حق کی پرکیف جھلکیاں اس پر ظاہر ہوتی ہیں بالکل اسی طرح جس طرح بجلی کوندتی ہے اور خاموش ہو جاتی ہے اور

---

۱ : شرح اشارات ۳۸۴/۳

۲ : "اس کے بعد" کا جملہ شیخ کی پہلی کہی ہوئی باتوں سے مربوط ہے کہ جس کی اس گفتگو میں ضرورت نہیں تھی۔

۳ : عارفوں کے نزدیک "ارادہ" حضرتِ حق کی جستجو میں دل کی حرکت کا نام ہے، علاوہ ازیں اس کے اور بھی معانی ہیں۔

اس کیفیت کو اربابِ فن "وقت" کا نام دیتے ہیں۔ ہر "وقت" دو وجدوں کے درمیان قرار پاتا ہے ایک اس کے انتظار اور دوسرے اس کے فرق کا وجد (مُراد غم وغصّہ کی وہ کیفیت ہے کہ جو نور کے مشاہدہ کے بعد اس کی مفارقت اور اس کیفیت کے زوال کے سبب سالک پر طاری ہوتی ہے) اور پھر ان کیفیات میں اضافہ اس وقت ہوتا ہے جب سالک ریاضت میں غرق ہو جاتا ہے۔

نتیجہ

پس یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ "چشمِ بیمار" سے مُراد حقِ سُبحانہ تعالیٰ کی عنایات ہیں کہ جن کا ایک مصداق وہ مذکورہ نور اور اس کی وہ جھلکیاں ہیں کہ جو ابھی معرضِ گفتگو میں آچکی ہیں اور "بیمار شدم" سے مُراد وجدِ دوم کی کیفیت ہے کہ جو مشاہدہ کے بعد عمل میں آتی ہے۔

(پس اے دوست غور و فکر سے کام لو کہ اس کے بغیر بات نہیں بنتی۔)

دوسری صورت

یہ کہ "چشمِ بیمار" سے مُراد "جزبہ" اور "بیمار شدم" سے "جذب کی کیفیت" ہو۔ دوستو۔ اس بے بضاعت اور وقت ضائع کرنے والے حقیر فقیر کو اس بات سے باز رکھیں کہ وہ اس کے اجمال میں جائے اور اس کی وضاحت میں بیش ازیں قلمفرسائی کرے اس لئے کہ پہلی بات تو یہ کہ میں ایسا کرنے سے شرعًا معذور ہوں۔

اور ثانیًا: کہاں ثریٰ اور کہاں ثریّا؟ اور بقول سیّدالادبا علامہ سیّد علی خان مدنی رضوان اللہ علیہ:

«انّی لمرتعش الجناح تستّم هذاالمطار. و لمرتعد الجنان تمحّم هذه الأخطار؟»

یہاں خلل انداز ہونے والے اس اختصار سے بچنے کے لئے مجھے بعض اکابرینِ فن کی کچھ باتیں نقل کرنی ہوگی:

«اعلم أنّ النفس الأنسانيّة بحكم خواصّ التطوّرات و غلبة احكام [1] الطّبيعيّة و الحيوانيّة عليه. كانت غافلة عن اصل فطرتها:

---

[1]: كذا، والصواب: الاحكام

متوجّهة الى خظوظها المختصّة بالنّشأة الحسيّة العاجلة، منغمرة في الشهوات الزائلة الفاسدة، و امّارة بالسّوء، فشمل حكم هذه الغفلة السّرّالالهى الوجودى؛ و حقيقة الا ثر الرّوحانى؛ و حقيقة النفس الانسانيّة الحيوانية؛ و غلبت احكام الكثرة على هذه الحقائق الثلا ثة؛ و انحرفت اخلاقها ، اما الى تفريط او افراط؛ فخفى اثر القلب الوحدانى الاعتدالى فى كل منها؛ بل استهلك بالنسبة الى بعض الأشخاص، فاذن [1] الناس لايخلو من احد الثلا ثة؛ اما ان يكون قد استهلك اثر القلب الاعتدالى فيه، كاستهلاك الصورة فى الممسوخين و ضاع رأس ماله و استعداده، فهو لم يؤمّل للسلوك بل من المتمكنين فى اسفل السّافلين.

و امّا ان يكون قد شملته العناية الإلهيّة من الوجه الخاص، و طريق انحراف سرّه الوجودى المفاض على حقيقته، و عليه وسع الأثر الرّوحانى، والنفس الأنسانيّة، بموجب جذبة من جذبات الحقّ يوازى عمل الثّقلين، فيكون من الأولياء الذين اخرجهم من الظّلمات الى النّور بلا سعى و تعمّل، و هو الّذى يقطع الحجب بالجذبات الإلهيّه و هوالمحبوب المراد تيخّطف بالجذب قبل السلوک، و لايعرف المنازل و المقامات الا عند رجوعه من الحقّ الى الخلق، لتنوره بالنورالإلهى و تحقّقه بالوجود الحقّانى، و نعم ما قيل بالفارسيّة:

---

[1]: كذابه قيل: ان هذا الحرف اذا نصب الفعل كتب بالنون والاقبالالف

خوش آن مستی که هشیار از حرم خیزد از آن غافل
که بود اندر میان راهی؛ و اندر راه منزلها

(انتهی کلامہ)

اس بزرگ کی بات ختم ہوئی، راقم یہ حروف زیب قرطاس کرتا ہے:

نصیحت وتحذیر

لعلّک تظّن أن ما اسلفناه من الکلام عن بعض الأکابر من الأعلام کلام سهل یفهمه الخواصّ و العوامّ. کلاّ. بل هو من العویصات و المعضلات. سیّما اذا ورد مجرّداً عن التّعلیقات و التّوضیحات. و ایّاک و الإغترار بفهمک فی أمثال هذه المطالب. فانّها لا تنحل بمجرّد الاصطلاحات من کلمات ارباب الاذواق و المشارب. و اعلم أنّ ما یفیده ذلک الکلام انّما یتحصّل للأنبیاء ـ صلوات الله علیهم ـ و الکمّل من الأولیاء، ولعلّ فی بعض کلمات هؤلاء الأعلام رمز فی التعبیر؛ أو تسامح فی التقریر؛ یحتاج الی توضیح و بیان؛ و لیس کما یزعمه بعض الجهلة من مدّعی العلم و العرفان؛ فإیّاک ان تکون من السّماعین لکذبهم و الأکّالین من سحتهم؛ و الله سبحانه یقول: «فلینظر الإنسان الی طعامه» [1] فتأمّل.

---

۱ عبس: ۲٤

و قال سبحانه و تعالى: «و ان ليس للإنسان الاّ ماسعى.» [1]

و قال عزّ من قائل: «والذين جاهدوا فينا لنهدّينهم سبلنا.» [2]

و قال جلّ شأنه: «و من يؤمن بالله يهد قلبه.» [3]

و قال و هو اصدق القائلين: «و ان تطيعوه تهتدوا.» [4]

و عن ابى عبدالله ـ عليه السّلام ـ قال: «اوحى الله الى موسى ـ عليه السّلام ـ يا موسى تدرى لم اصطفيتك بكلامى دون خلقى؟ قال: ياربّ و لم ذاک؟ فاوحى الله تعالى اليه: يا موسى انّى قلبت عبادى ظهراً لبطن فلم اجد فيهم احداً أذلّ نفساً لى منک؛ يا موسى إنّک إذا صلّيت وضعت خدّک على التّراب ـ أو قال: على الأرض .» [5]

فخذ هذه الإشارات و تدبّر فيها و لا تترک العمل و المجاهدات؛ و الله يقول الحقّ و هو يهدى السّبيل.

تیسری صورت

یہ بات بھی کہی جاسکتی ہے کہ "چشم" عین اللہ ہے کہ جو امامِ زمانہ صلوات اللہ وسلامہ علیہ وعلی آبائہ الطاہرین کی ذاتِ گرامی سے عبارت ہے چنانچہ ہم آپ کی زیارت میں آپ کو اسی لفظ سے

---

[1]: النجم ۳۹ [2]: العنکبوت ۶۹ [3]: التغابن ۱۱ [4]: النور ۵۴ [5] الشیخ الحر العاملی الجواہر السنیۃ فی الاحادیث القدسیۃ ص ۴۵۔

مخاطب کر کے کہتے ہیں : السّلام علیک یا عین اللہ فی خلقہ"[1]

تتمہ کلام

یہ بات آپ کے علم میں ہونا چاہیئے کہ حضرتِ شاہِ ولایت صلوات اللہ علیہ کی زبانِ مبارک سے " انا عین اللہ " کا جملہ بارہا نقل ہوا ہے اور ائمہ طاہرین صلوات اللہ علیہم اجمعین کا "عین اللہ" ۔ "ید اللہ" "جنب اللہ" "لسان اللہ" اور قلب اللہ الواعی" ہونا وہ حقیقت ہے کہ جو بے شمار احادیث میں اربابِ وفکر ونظر کے نزدیک مسلم و متفق علیہ ہے' یہ وہ مقام ہے کہ جس میں بہت سے اسرار و مطالب پوشیدہ ہیں اور اس سلسلے میں اولیاء اللہ ہی سے کسبِ فیض ہو سکتا ہے نہ اس گنہگار اور روسیاہ سے'

چہ نسبت خاک ، با عالم پاک۔

گوشہ گیری وسلامت ہوسم بود ولی
فتنہ میکند آن نرگس فتان کہ میرس

بیکی جرعہ کہ آزادکش درپی نیست
زحمتی می کشم از مردم نادان کہ میرس

گفتگو ہاست دراین راہ کہ جان بگدازد
ہر کسی عربدۂ این کہ مبین آن کہ میرس

[1] : جمال السالکین ابنِ طاؤس، جمال الاسبوع ص ۳۷

قال سیّد الفقہاء قدس اللہ روحہ الشریف

فارغ از خود شدم و کوس انا الحق بزدم
ہمچو منصور خریدارِ سر دار شدم

اصطلاحات اور مفرد الفاظ کی شرح

"فارغ از خود شدم"، خود کو فراموش کیا۔ بُھلا دیا۔ حافظ کہتے ہیں:

گرچہ یاران فارغند از یادِ من
از من ایشان را ہزاران یاد باد

اس اصطلاح کی مثالیں فارسی ادب اور شعراء کے کلام میں کثرت سے پائی جاتی ہیں۔ لہٰذا اس میں زیادہ وقت صرف کرنا بات کو طول دینا ہے۔

"کوس زدن"، طبل پر ضرب لگانا ہے، شعراء اور ادباء کی اصطلاح میں، استعمال کی صورت کے اعتبار سے یہ لفظ مختلف مفہوم پیش کرتا ہے، جیسے: کسی چیز کو اعلان کرنا۔ معاشرے میں کسی کے لئے کسی عنوان کو مقرر کرنا وغیرہ (تاہم ان مفاہیم کی بازگشت تقریباً ایک ہی مفہوم پر ہوتی ہے) زیادہ دقیق تعبیر میں ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ یہ اصطلاح مذکورہ موارد میں ان مفاہیم کا کنایہ ہے۔

"منصور"، حسین بن منصور حلاّج ہیں کہ جنھیں ۳۰۹ ہجری قمری میں قتل کر دیا گیا۔ ان کے انا الحق کہنے اور سولی چڑھنے کی داستان بہت مشہور ہے اور تمام تاریخ کی کتابیں اور ترجمے خاص طور پر عرفاء اور صوفیہ کے تذکرے اُن کے حالات سے بھرے ہیں۔

یہ حقیر اُن کے حالات، آثار، انجام کار اور عقائد کو بیان کر کے بات کو طول دینا نہیں چاہتا۔ بس صرف یہ عرض کرنا چاہتا ہے کہ حلاّج کے افکار کی پیدائش، اس کے عقائد و آثار اور مجموعی طور پر ہر چیز میں اختلاف اور تناقض ہے کچھ لوگ اس کی تعریف کرتے ہیں اور کچھ تنقیص، حلاّج کے قریبی دور سے تعلق رکھنے والا

ابنِ ندیم[1] کہ جس کی سنہ وفات ۳۸۵ ہجری قمری ہے اپنے ترجمہ کے ابتدائی حصّے میں قبل اس کے اپنی بات کو تمام کرے، لکھتا ہے:

"ولیس یصح فی امرہ وامر بلدہ شیئ بتۃ"[2]

ترجمہ:

ان کے (یعنی حلّاج کے) اور اس کی جائے پیدائش کے بارے میں البتّہ کوئی صحیح خبر نہیں ملتی۔

شیخ صدوق اور شیخ الطائفہ علّامہ طوسی رضوان اللہ علیہما نے ان پر متعرض کیا ہے[3] اور قدماء میں خطیب بغدادی نے بھی کسی قدر تفصیل سے ان کے حالات لکھے ہیں[4]

میرے محترم قارئین: میرا مقصد حلّاج کی حمایت کرنا نہیں ہے۔ مَیں نے ابنِ ندیم کی جس عبارت کو نقل کیا وہی آپ کے لئے تحقیقات کی ایک کڑی بن سکتی ہے اور اُن کے حالات کی جستجو

۱:- بعضوں کا خیال ہے اس شخص کا نام ابنِ ندیم نہیں بلکہ صرف ندیم ہے۔

۲:- الفہرست ط ایران ص ۲۴۱۔

۳:- محدث قمی، الکنی والالقاب ط نجف اشرف ۲/ ۱۶۷۔

۴:- تاریخ بغداد ۸/ ۱۱۲۔

میں ایک چابی کا کام دے سکتی ہے۔ اگر میرا مقصد ان کی حمایت ہوتا تو میں ان مآخذ کو پیش نہیں کرتا جن میں ان کی قدح کی گئی ہے، جیسا کہ آپ نے ملاحظہ فرمایا ہم نے حلاّج کے بارے میں حریتِ فکر سے کام لیا تاہم ان باتوں سے ہمارا مقصد یہ بھی ہے کہ جن ابیات کی ہم شرح لکھ رہے ہیں کہیں وہ ناقص نہ رہ جائیں۔

اب ہم اصطلاحات اور منفرد الفاظ کی شرح کی منزل پر یہ دیکھنا چاہتے ہیں کہ "انا الحق کہنے اور پھانسی کے پھندے کے خریدار بننے" سے مُراد کیا ہے؟ اس بیت کی تفسیر میں دو باتیں متصور ہیں۔

پہلی یہ کہ جس کسی کو فارسی ادب سے لگاؤ ہے وہ یہ بات جانتا ہے کہ ادبیات ایران میں اس بیت کا کُل مفہوم تقریباً ضرب المثل کی منزل میں آتا ہے اور یہ استقامت، پامردی، مشکلات و مصائب جھیلنے اور لوگوں کے ہدفِ ملامت بننے کی طرف کنایہ ہے۔

دوسری یہ کہ، منصور اور اس کے پھانسی چڑھنے کی داستان کبھی افشاءِ راز اور عام عقلوں سے بالا گفتگو کے سلسلے میں بطور مثال لائی جاتی ہے؛ چنانچہ حافظ کہتے ہیں:

گفت آن یار کزو گشت سر دار بلند
جرمش آن بود کہ اسرار ہویدا میکرد

حلّاج بر سر دار این نکتہ خوش سراید
از شافعی پرسید امثال این مسائل

اسی طرح سنائی کہتے ہیں:

پس زبانی کہ راز مطلق گفت
بود حلّاج کو انا الحق گفت
راز خود چون زروی داد بہ پشت
راز جلّاد گشت و او را کشت [1]

عرفانی تفسیر

"فارغ از خود شدم" خود سے فراغت اختیار کرنا۔ خود کو فراموش کرنا صاحبِ قلبِ سلیم کی خوبیوں میں سے ہے؛ حدیث میں آیا ہے کہ کسی نے حضرت امام جعفرِ صادق علیہ السّلام سے "اِلاّ من اتی اللہ بقلبِ سلیم" [2] کی آیت کے بارے میں پوچھا، آپنے فرمایا: قلبِ سلیم وہ قلب ہے کہ جو اپنے پروردگار سے ملاقات کرتا ہے اس حال میں کہ سوائے خدا اس میں اور کوئی نہیں ہوتا۔ [3]

۱:- حدیقۃ الحقیقۃ ط مدرس رضوی ص ۱۱۳۔

۲:- شعراء ۸۹

۳:- اور ۳ کو نورانی کتاب "الشموس الطالعہ" سے نقل کیا ہے۔

یہ مضمون اہلِ بیتؑ وحی و عصمت صلوات اللہ علیہم سے وارد ہونے والے ادعیۂ ماثورہ میں کثرت سے آیا ہے؛ حضرت سیّد الساجدین صلوات اللہ علیہ فرماتے ہیں:

"الٰھی اخصلت بانقطاعی الیک، واقبلت بکلی علیک"

"پروردگار میں نے اپنے پورے وجود کے ساتھ تیری طرف رُخ کیا ہے۔"

اس سلسلے میں اعلیٰ ترین مفاہیم مناجات شعبانیہ میں ملتے ہیں جو کوئی اس کا اہل ہے اور حضور قلب رکھتا ہے اور اس حقیر کی طرح نااہل نہیں وہ یقیناً اس کی طرف رجوع کرے۔

سالک کی اپنے آپ سے بے خبری کے بارے میں شیخ الرئیس ابنِ سینا کی ایک قابلِ قدر عبارت

«فاذا عبر الریّاضة الی النیل صار سرّه مرآةً مجلوّةً محاذیاً بها شطر الحقّ، و درّت علیه اللّذات العلی، و فرح بنفسه لما بها من اثر الحق، و کان له نظر الی الحق و نظر الی نفسه، و کان بعد متردّداً.

اشارة۔ ثمّ إنّه لیغیب عن نفسه فیلحظ جناب القدس فقط، و ان لحظ نفسه فمن حیث هی لاخطة لامن حیث هی بزینتها. و هناک یحقّ الوصول.»[1]

۱:- الاشارات والتنبیهات ۳/۳۸۶

ترجمہ و تشریح

جب ریاضت انجام کو پہنچتی ہے تو سالک کا باطن حق کا آئینہ بن جاتا ہے اور حقیقی لذتیں اس پر وارد ہوتی ہیں اور وہ اس حال میں اپنے آپ سے خوش اور شادماں ہوتا ہے اس لئے کہ وہ حق کے اثر کو اپنے اندر مشاہدہ کرتا ہے پھر وہ ایک نظر حضرتِ حق پر ڈالتا ہے اور ایک اپنے آپ پر، بس اس صورت میں وہ دو نظروں کے درمیان سرگرداں ہو جاتا ہے۔

اور پھر ایک ایسے مرحلہ میں پہنچتا ہے کہ اپنے آپ کو گم کر دیتا ہے اور صرف حضرتِ حق کے مقامِ قدس کو دیکھنے لگتا ہے اور اس کی ذات اس کے لئے صرف اس حد تک رہ جاتی ہے کہ وہ ایک دیکھنے والا اور مشاہدہ کرنے والا ہوتا ہے اور بس، اس کے مشاہدہ میں اس کی زینت نہیں ہوتی اور یہ وہ منزل ہے جہاں وصال حقیقت کا جامہ پہنتا ہے۔

تبصرہ پر منحصر گفتگو

"قولہ: وھناک یحق الوصول"، معلوم ہو کہ اہلِ نظر نے مقامِ تمکین کو تلوین سے (یعنی اسلوب کلام میں تبدیلی لانے سے)

زیادہ اشرف و اعلیٰ جانا ہے اور یہی حق ہے۔ آقای میرزا ہاشم اشکوری قدس سرہ نے (کہ جنھوں نے مفتاح الانس، نصوص اور تمہید القواعد کی کتابوں پر حاشیہ لکھا ہے) صدرالدین قونوی کی نصوص پر اپنے حاشیہ میں بعض اکابر علماء سے نقل کیا ہے اور کہا ہے کہ وہ مقامِ تلوین کو مقام تمکین سے زیادہ ارفع و اعلیٰ جانتے ہیں۔ اس کے بعد مرحوم اشکوری نے اس عارف کی عبارت کی توجیہ ان الفاظ میں کی۔

: ان مقام التلوین اعلی من مقام التمکین. فمراده التمکین قبل الوصول. لأن الوقوف فی بعض المقامات مذموم، اذلایصحّ ولایمکن الترقّی فی الدرجات الابثبوت مقام التلوین. فإن التلوین یترقی من مقام الی مقام. لا التمکین الذی فی المرتبة الجمعیة الرافع لحجاب الخصوصیّة بالنسبة الی التلوینات الّتی فی صراط ذلک التمکین؛ فافهم.» [1]

۱: مرحوم اشکوری کے حواشی میں گفتگو کا یہ حصہ کہیں چھپنے میں نہیں آیا تھا یہاں تک کہ سید الحکماء جناب آقا سیّد جلال الدین آشتیانی ادام اللہ عزہ نے رسالۂ نصوص قونوی کے آخر میں اسے طباعت کی منزل سے گذارا جیسا کہ آپ کی توضیحات سے پتہ چلتا ہے کہ ان حواشی کو اُستادِ بزرگ مرحوم آقا مرزا احمد آشتیانی قدس سرہٗ نے اپنے اُستاد آقا میرزا ہاشم کی تحریر سے استنساخ کیا تھا جسے بعد میں اس وقت انھوں نے آقائی سید جلال الدین اشتیانی کے حوالے کیا جب آقائی میرزا احمد کے محضر سے کسبِ فیض کر رہے تھے۔

"کوس انا الحق بزدم"

قبل اس کے کہ میں اس حصے کی عرفانی تفسیر میں کچھ عرض کروں چند باتیں تمہیداً بطورِ اختصار پیش کرنا چاہوں گا۔

پہلی بات

محترم قارئین! اس طرح کے جملوں اور اس طرح کی اصطلاحوں سے بعض اوقات کچھ ایسے بدخواہ اور بدنیت افراد کو بہانا مل جاتا ہے جن کے پاس نہ وافر علم ہوتا ہے اور نہ روکنے ٹوکنے والا ایمان۔ لہٰذا وقت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے وہ مٹھی بھر سادہ لوح انسانوں کے عقائد میں رخنہ ڈالتے ہیں اور ان کے دلوں میں علماء اور فضلا کی نسبت شک و شبہات پیش کرتے ہیں۔ حضرت عبدالعظیم حسنی نے حضرت جوادؑ کے حوالے سے حضرت امیرالمومنین علیہ السّلام کی یہ روایت نقل کی ہے کہ آپؑ نے فرمایا:

مجالسۃ الاشرار تورث سوء الظن بالاخیار [1]

"بروں کی صحبت اس بات کا سبب بنتی ہے کہ لوگ اچھوں سے بدگمان ہو جائیں۔"

پس متقی صالح اور دیانت دار لوگوں پر لازم آتا ہے کہ وہ آگاہ

۱۔ محدثِ قمی، منتہی الآمال جلد۲ ص ۲۳۰۔

رہیں اور اس طرح کے لوگوں سے ایسی باتیں سُنکر بلا تحقیق ان کی ہاں میں ہاں نہ ملائیں اور ان کے جال میں نہ پھنسیں بلکہ جب کبھی مخالفین خواہ وہ دشمنوں سے ہوں یا جاہلوں سے۔ ان سے اس طرح کی گفتگو کریں تو وہ اُسے علمائے ربانی اور باخبر لوگوں کے سامنے پیش کریں تاکہ شبہ کا ازالہ ہو۔

دوسری بات

کبھی مخالفین، جیسا کہ پہلے بھی ارشاد ہو چکا، اکابرین کے بعض جملوں اور اصطلاح کو سُنکر انہیں معاذ اللہ، ہمہ اوست، جیسی مسلکوں سے وابستہ کرتے ہیں اور ناروا باتیں اُن سے منسوب کرتے ہیں۔ اس طرح کی نسبتیں کوئی نئی باتیں نہیں۔ (لیس هذا اوّل قارورة کسرت فی الاسلام) یہ نسبتیں یا دشمنی کی بنیاد پر ہوتی ہیں۔ یا ان کا سرچشمہ جہل ہوتا ہے۔ ہمارے اکابرین کا مقام اس سے بالاتر ہے کہ ان الفاظ میں ان کی حمایت کی جائے اور یہ ایسا ہی ہے کہ جیسے کوئی عابد اور زاہد بزرگ کے بارے میں یہ کہے کہ: فلاں چوری نہیں کرتا۔ لیکن اس کا کیا کیا جائے کہ جاہل انسان سے بات کھینچتا ہے ہم یہ نہیں کہتے کہ کوئی دلیل ہے۔ دنیا میں ہرگز کوئی ایسا نہیں کہ جو حلولی یا اتحادی نہ ہو۔ ہمارا ہرگز ان لوگوں سے کوئی سروکار نہیں بلکہ ہم یہ کہتے ہیں کہ اہلِ بیتؑ

عصمت و طہارت کے پیروکاروں میں کون سے مایہ ناز عرفاء اور حکماء ایسے ہیں کہ جو حلول اور اتحاد کے قائل تھے یا ہوں تو یا کون ایسا ہے کہ جسکا مسلک "ہمہ اوست" کے عقیدے پر استوار ہوں؟

"ھاتوا برھانکم ان کنتم صادقین"

اس کے سوا اور کیا ہے کہ یہ لوگ غیر حق کو[2] وجود حق کے مقابل ناچیز اور لاوجود جانتے ہیں اور کہتے ہیں:

بحقش کہ تا حق جمالم نمود
دگر ھرچہ دیدم خیالم نمود

یا پھر یہ کہ:

ہمہ ہرچہ ہستند از آن کمترند
کہ با ہستیش نام ہستی برند

کیا یہ عالی مرتبت لوگ کہ جنکی زبانِ حال اور جس کا خلاصۂ کلام یہ اور اس طرح کے اشعار ہوں پہاڑ، دریا اور درخت کو پوجنے والے تھے اور کیا وہ آدھی آدھی رات کو "حتیٰ کہ اسپتال کے بستر پر اپنی آخری سانسوں میں جمادات کے مقابل آنسوؤں کا نذرانہ پیش کرتے تھے؟ اور سرکش بنکر "الٰہی العفو" کہتے تھے؟ آخر عقل بھی کوئی چیز ہوتی ہے۔

۱- اپنے جہل اور اپنی نادانی اور نارسائی کے ساتھ اس منزل پر میں کچھ کہنا چاہتا تھا مگر پھر میں نے اس سے صرفِ نظر کر لیا۔

اس مقام کے متعلق ایک عظیم راز

قال السّیدالأجلّ السیّد علیخان المدنی الشیرازی۔ قدّس الله سرّه۔ : «اسم الله الأعظم هوی الذی افتتاحه الله و اختتامه هو. و لایکون معجماً و لا یتغیّر قرائته. اعرب ام لم یعرب. و قد وقع فی القرآن المجید فی خمس سور. و هی البقرة و آل عمران و النساء و طه و التغابن.» [1]

انتهی ما اردنا نقله من کلامه.

قلت: و فی بعض الأدعیة: «یا هویا من هویا من لیس هو الاّ هو.»

قلت: یستفاد من کلام بعض الأعاظم أن المواظبة علی امثال هذا الذکر مع الشرائط اللازمة یفید العبد شوقاً الی الله تعالی. [2]

۱: الکلم الطیب ص ۵۶ ۲: حضرت آیت اللہ بہاءالدینی۔ متعنا اللہ بطول بقائہ۔ نے خود اس حقیر سے فرمایا۔ ایک سال ایسا آیا ہے کہ ٹڈی دلوں نے قم پر حملہ کر دیا ایک باغ کے مالک نے گھبرا کر شہر کا رُخ کیا اور اس مُصیبت سے نمٹنے کے لیے کچھ مزدور جمع کر کے انہیں اپنے ساتھ لایا۔ جب وہ سب کے سب باغ پہنچے تو ان میں سے ایک مزدور باغ کے بیچ میں لیٹ گیا باغ کے مالک کو غصّہ آیا پھر کر مزدور سے کہا۔ یہ کون سے لیٹنے کی جگہ تمھیں یہ ساری ٹڈیاں تمھیں دکھائی نہیں دیتیں۔ مزدور نے نہایت اطمینان سے کہا تم چاہتے ہو کہ میں ایک ہوں، کہو یہ ساری ٹڈیاں بھاگ جائیں باغ کے مالک نے کہا کہو۔ مزدور اُٹھ بیٹھا اور ایک مرتبہ اس نے کہوں کی آواز بلند کی، ہوں، کا کہنا تھا کہ تمام ٹڈیاں اُڑ کے چلی گئیں۔

حقیقت عرض کرتا ہے کہ برادرِ عزیز دھان کہیں اور نہ جائے۔ یہ دُکان چمکانے والی بات نہیں ہے اگر اس مزدور کی کیفیت ہم میں اور تم میں پیدا ہو جائے تو ہم سے بھی ایسے کام رونما ہو سکتے ہیں یہ معمّر مزدور کے شاملِ حال تھا۔

تیسری بات

گزشتہ صفحوں میں ہم نے یہ عرض کیا تھا کہ ہمیں ان مباحث میں منصور حلاج سے کوئی سروکار نہیں۔ نہ ہمیں مثبت پہلو میں ان لئے کچھ کہنا ہے نہ منفی پہلوؤں میں اور بھی نہیں ہے کہ ہم حضرت امام رضوان اللہ تعالیٰ علیہ کو منصور سے تشبیہ دینا چاہتے ہوں یا منصور کے کلام پر امام کے کلام کا قیاس کرنا چاہتے ہیں امام نے یہ غزل کہی ہے اور اس میں ایک تشبیہ سے کام لیا ہے اور ہم نے وجہ تشبیہ کو اصطلاحات اور مفرد الفاظ کی شرح کے باب میں ذکر کیا ہے۔ پس اس باب میں جو باتیں زیر بحث آئیں گی وہ صرف اس لئے ہوں گی کہ بات ادھوری نہ رہ جائیں۔ اور اذھان کسی قدر حضرت امام کے جملے کی تفسیر کے لئے آمادہ ہو جائیں۔

عرفاء نے بعض افراد کی طرف سے نقل ہونے والے، انا الحق، اور اس طرح کے دوسرے جملوں کی مختلف طریقوں سے توجیہ کی ہے۔ ان توجیہات میں سے ہم یہاں صرف دو کو آپ کی خدمت میں پیش کریں گے۔

پہلی توجیہ

کہتے ہیں، اس طرح کے الفاظ بعض افراد سے عالمِ بے خودی

میں اس وقت سرزد ہوتے تھے جب وہ حق کی محبّت کے شراب سے مست اور بے خبر ہو جایا کرتے تھے۔ مگر جب یہ حال ان پر طاری نہیں ہوتی تھی تو اس طرح کی باتیں ان کی زبان سے نہیں نکلتی تھیں۔ لاھیجی[1] شیخ محمود شبستری کے ان اشعار کی شرح میں کہ:

انا الحق کشف اسرار است مطلق
بجز حق کیست تا گوید انا الحق
ہمہ ذرّاتِ عالم ہمچو منصور
تو خواہی مست گیر و خواہ مخمور
در این تسبیح و تحلیلند دائم
بدین معنی ہمہ باشند قائم

کہتے ہیں: اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ اس راز کا انکشاف سوائے حالتِ مستی اور مطلق بے خودی کے یا خمار کے اس درجہ میں کہ جو سرتاسر بے خودی ہے اور فنا و سکر کے تنزل کے باوجود خمار کی زیادتی مستی کو قابو نہیں کر سکتی اور کہیں جائز نہیں ہے اور شریعت اور طریقت دونوں اس کی ممانعت ہے۔[2]

۱: البتہ ان دو توجیہات کے علاوہ ایک توجیہ اور بھی شبستری اور لاھیجانی کے کلام میں پائی جاتی ہے لیکن ہم اس منزل پر صرف اپنی دلیل کی حد تک جن باتوں کو سامنے آنا چاہیئے اسی پر اکتفا کرتے ہیں۔

۲: شرح گلشن راز۔ ص ۳۶۹۔

دوسری توجیہ

شبستری کہتے ہیں۔

ہر آن کو خالی از خود چون خلا شد
انا الحق اندر او صوت و صدا شد

لاھیجی اس شعر کی شرح میں لکھتے ہیں: "وہ جماعت کہ جو اس بات کی قائل ہے کہ ایسا مکان جس میں جسم متمکن ہوتا ہے خلا ہے۔ دو فرقوں میں منقسم ہے ایک فرقہ وہ ہے جس نے خلا کی تعبیر مطلقاً بلاشیئ کی ہے اور دوسرا وہ ہے کہ جو اسے کسی قدر مادّہ سے مجرد جانتا ہے۔ وہ فرماتے ہیں جو کوئی مطلقاً لاشے یا کسی قدر مادّہ سے مجرد والی خلا کی طرح خود سے یا اپنے تعین سے اپنے آپ کو خالی کر لیتا ہے اور اپنے وجود اور اپنی ہستی کو مٹا دیتا ہے تو اس کے بغیر اس کے اندر "انا الحق" کی صدا گونجنے لگتی ہے اور صدا اُس خالی جسم کی آواز کا انعکاس ہے کہ جو بولنے والے کے مقابل فروکش ہوتا ہے یعنی وہ "انا الحق" کہ جو منصور اور دوسری کے صیقل شدہ ذات میں مسموع تھا صوتِ حق اور نطقِ حق سے عبارت تھا کہ جو بطریق انعکاس، آواز کی صورت میں منصور اور دیگر لوگوں سے سُنا جاتا تھا اور لوگ یہ سمجھتے تھے کہ وہ خود اس طرح کی بات کہہ رہے

ہیں، اس کی مثال ایسی ہی ہے کہ جیسے کوئی پہاڑوں سے گھری وادی میں آواز بلند کرے اور وہ آواز انعکاس کے سبب پہاڑوں سے سُنی جائے اور نادان لوگ کہیں کہ اس آواز کا تعلق پہاڑ سے ہے اور پہاڑ ہے کہ جو بول رہا ہے۔[1]

ایک معقول اعتراض کا جواب

اگر کوئی یہ کہے کہ گلشنِ راز سے تم نے جو دو توجیہیں پیش کی ہیں وہ تقریباً ایک ہی توجیہ کو پیش کرتی ہیں پھر انہیں دو حصّوں میں تقسیم کرنے کا سبب کیا ہے؟ تو ہم عرض کریں گے کہ: ہماری تقسیم ایک مرحلے میں قائل کے قول کی نسبت کے اعتبار سے ہے اور دوسرے مرحلہ میں قائل سے کُلّی طور پر سلب نسبت اس کا سبب ہے۔ فافہم۔

عرفانی تفسیر اور نتیجہ

محترم قارئین اگر پچھلے مطالب اور پچھلی تمہیدیں خوب اچھی طرح آپ کی نظر میں ہیں اور آپنے بات کو منصور حلّاج سے میری ذاتی لگاؤ پر محمول نہ کیا ہو کیونکہ میں نے بارہا یہ عرض کیا ہے کہ مجھے منصور سے کوئی سروکار نہیں، مَیں نے تو صرف حضرت امام کے کلام سے اپنا

۱: شرح گلشنِ راز ص ۳۷۵۔

تعلّق قائم کیا ہوا ہے) اور آپ میری دوسری توجیہ میں[1] مفہوم کی نوعیت پر توجّہ کریں اور اس کے بعد آنے والے مطالب پر غور کریں تو آپ حضرت امام رحمۃ والسّلام کے کلام کی تفسیر میں کسی نتیجہ تک پہنچیں گے۔

شیخ بہائی قدس سرہ "مفتاح الفلاح" کی نفیس اور نورانی کتاب میں سورۂ مبارک حمد کی تفسیر کرتے ہوئے لکھتے ہیں: روی أنہ

[یعنی الصّادق علیہ السلام] کان یصلّی فی بعض الایّام فخرّ مغشیاً علیہ فی أثناء الصّلاۃ؛ فسئل بعدھا عن سبب غشیتہ؛ فقال: مازلت أردّد ھذہ الآیۃ حتّی سمعتھا من قائلھا.

قال بعض العارفین: إنّ لسان جعفر الصّادق ــ علیہ السّلام ــ کان ذلک الوقت کشجرۃ الطّور عند قولہ: (إنی انا اللہ)[2] و ما احسن قول الشیخ الشبستری بالفارسیّۃ:

ترجمہ:

روایت ہے کہ حضرت امام صادق علیہ السّلام کسی دن نماز میں مشغول تھے کہ اچانک ان پر غشی طاری ہوئی؛ بعد میں ان سے بیہوشی کا سبب پوچھا گیا امام علیہ السّلام نے جواب دیا: میں آیت کی تکرار کر رہا تھا کہ اچانک میں نے اسے اس کے والے کی آواز میں سُنا۔ (اور مجھ پر غشی طاری ہو گئی)

۱: ہر پابندی سے آزاد ہو کر۔ ۲: القصص: ۳۰

شیخ فرماتے ہیں:

بعض عرفاء کا کہنا ہے کہ حضرت امام صادق علیہ السّلام کی زبانِ مبارک اس موقع پر طور کے درخت کی مانند تھی کہ جس نے گویا ہو کر کہا "انی انا اللہ" اور شیخ شبستری نے فارسی میں کیا خوب کہا ہے۔

روا باشد انا الحق از درختی

چرا نبود روا از نیک بختی

میرے دوستوں اس مسئلہ میں غور کرو کہ شیخ بہائی بھی مفہوم کی نوعیت کو پیشِ نظر رکھے ہوئے ہیں اور اس طرح کی کیفیت کو خارج از امکان نہیں جانتے اور انھیں بھی حلّاج سے کوئی کام نہیں ہے۔

قطعی اور آخری نتیجہ

پس آپ نے عرفاء کی دوسری توجیہ کو (کہ جسے مفہوم کے اعتبار سے جانچنے کی بات طے ہوئی) مشاہدہ فرمایا اور شیخ بہائی کی اس روایت کو بھی دیکھا جو اس مفہوم کو پیش کرنے کے امکان پر ناظر تھی۔

اب آپ ان پر قرآنِ مجید کی دو آیتوں کا اضافہ فرمائیے۔

«وللہ جنود السماوات والارض»[1] و «ان اللہ علی کل شيء قدیر»[2]

۱: الفتح: ۴۰ ۲: یہ جملہ قرآنِ مجید میں بہت سے مقامات پر آیا ہے جن میں سے ایک مقام سورۂ بقرہ آیت ۲۰ ہے۔ ۳: ص ۲۹۵-از طسنگی و ۲۹۳ از بیروت

تمام ذراتِ عالم اللہ کی ملکیت ہیں اور اس کے اختیار میں ہیں، یہ ہماری جسم و جاں اور یہ ہماری زبان اللہ کی ملکیت ہیں اور جنودِ خدا سے اُن کا تعلق ہے اور خدا ہر امر پہ قادر ہے، اب جب ایسا ہے تو کیا یہ بات دور از امکان ہے کہ ہمارا مہربان اور صاحبِ قدرت خدا کسی نیک اور شائستہ بندہ کی زبان کو بعض مخصوص حالات میں اپنے لئے محلِ صوت قرار دے؟[1]

ان فی ذلک لذکری لمن کان له قلب اوالقی السمع و هو شهید.

تحدیر پر مبنی گفتگو

اگر کوئی یہ کہے کہ: حضرت امام خمینی۔ قدس اللہ سرہ نے، ایک عظیم فقیہ اور مرجع تقلید کے عنوان سے اپنے شعر میں یہ جملہ ادا فرمایا ہے اور معاشرہ میں عالی رتبہ علماء، مخصوصاً مراجع تقلید بالاخص حضرت امام، لوگوں کے لئے نمونہ عمل اور ان کے مقتدا ہیں، پس کیا

۱: ہم ان تمام توجیہات کے بعد یہ نہیں کہنا چاہتے کہ امام رضوان اللہ علیہ کی مُراد یہ تھی کہ ایک آواز میری زبان پہ جاری ہوئی: خدا بہتر جانتا ہے کہ اس یگانۂ روزگار کا مقصد کیا تھا۔ ہم صرف یہ کہنا چاہتے ہیں کہ ان توضیحات کے ساتھ اس طرح کی باتیں بشرطِ شائستگی اور یہ اذنِ خداوندِ متعال عقلی اور علمی اعتبار سے دور از عقل نہیں ہیں۔

اُن کی غزل کے چھپنے کے بعد شعراء کے لئے یہ جائز ہوگا کہ وہ اپنے اشعار میں اس اصطلاح کو استعمال کریں؟

جواب:

البتہ اس شخص کے لئے کہ جو قُربِ الٰہی، سیرِ مدارجِ عبودیت، علمی مقامات میں قطع مسافت اور حقیقی عرفان میں ورود کے اعتبار سے حضرت امام کے شرائط میں نہ ہو جائز نہیں ہے؛ اور جیسا کہ گذشتہ وضاحتوں سے معلوم ہوا یہ امور کسی کے اختیار میں نہیں ہیں کہ جب چاہے کوئی اسے اپنے لئے ظاہر کرے بلکہ یہ خود سے ظاہر ہوتے ہیں۔ بعبارت دیگر کوئی از خود نہیں کہتا بلکہ دوسرے اس کی زبان سے کہتے ہیں۔ پس اگر کوئی ان شرائط کے بغیر تصنّع اور بناوٹ کے ساتھ اس طرح کے جملے نظم یا نثر میں لکھنا چاہے تو باطن کی تاریکی اور اللہ سے دوری کے سوا اسے کچھ حاصل نہیں ہوگا۔

دوسرا سوال: ممکن ہے کوئی یہ کہے کہ آپ نے اصطلاح کی شرح میں یہ کہا ہے کہ منصور کی داستان ضرب المثل کے طور پر استعمال میں آئی ہے پس جو کوئی امام کے شرائط میں نہیں ہے لیکن وہ ان اصطلاحات کو ضرب المثل کے طور پر استعمال کرتا ہے تو اس کی صورت کیا ہوگی؟۔

جواب: پہلی بات تو یہ ہے کہ ہم یقین کے ساتھ یہ نہیں کہہ سکتے

کہ امام نے اس شعر کو ضرب المثل کے عنوان سے پیش کیا ہے، خدا بہتر جانتا ہے ہوسکتا ہے انھوں نے اُسے امر واقعی کے مفہوم میں پیش کیا ہو، جو بھی ہو، ہم حضرت امام کے کلام کے تجزیہ اور اسباب بیان کی منزل میں تھے اور ہم نے کہا تھا کہ ممکن ہے یہ اصطلاحات مثال اور کنایہ کا پہلو بھی رکھتی ہوں۔

دوسرے یہ کہ اگر فرض کرلیا جائے کہ امام رضوان اللہ تعالیٰ علیہ نے ان اصطلاحوں کو کنایہ اور ضرب المثل کے عنوان سے استعمال کیا، تو ہماری توجّہ اس امر کی طرف ہونی چاہیئے کہ حضرت امام ایک جانی پہچانی شخصیت اور عالمی عظمت و اعتبار کے حامل ہیں اور ایک عظیم مرجع تقلید ہیں اور وہ کوئی جُملہ کہتے ہیں تو اس سے غلط فہمی پیدا نہیں ہوسکتی (لیکن دشمنی اور عداوت کا کیا کیا جاسکتا ہے دشمن تو پھر دشمن ہے) پس کیا ہی بہتر ہو کہ ہمارے محترم شعراء اس طرح کے جُملوں اور اسطرح کی اصطلاحوں کو حضرت امام جیسی شخصیتوں کے لئے مختص کردیں۔

قال وحید عصرہ وعزیز مصرہ الامام الخمینی قدس اللہ نفسہ الزکیہ:

غم دلدار فکندہ است بجام شرری
کہ بجان آمدم وشہرۂ بازار شدم

اصطلاحات اور مفرد الفاظ کی شرح:

"غم" لغت میں اندوہ اور تعزل میں زیادہ تر معشوق کی نسبت عشق وشوق کے مفہوم میں اس میٹھے درد سے عبارت ہے کہ جو شدید محبّت کے زیرِ اثر رونما ہوتا ہے اور مختصر لفظوں میں عشق ومحبّت سے کنایہ ہے۔

"دلدار" محبوب؛ معشوق۔

"شرر" انگارہ کہ جو آگ سے اچٹک کر الگ ہوتا ہے۔ محبوب کے فراق میں شدّتِ اندوہ سے کنایہ ہے۔

"بجاں آمدم" زندگی سے سیر ہوا۔

"شہرہ" شہرت؛ ناموری۔

"شہرۂ بازار" اس شخص سے کنایہ ہے کہ جو معاشرہ میں کسی بنیاد پر مشہور ہو اور اس کا فعل آشکار اور برملا ہو جائے۔

سعدی کہتے ہیں:

عشق سعدی نہ حدیثی است کہ پنہان ماند
داستانیست کہ بر ہر سر بازاری ہست

عرفانی تفسیر

یہ پورا شعر، صاحب شعر اعلیٰ اللہ مقامہ الشریف کے حقیقتِ حال کا ترجمان ہے اور خدا معصومین صلوات اللہ علیہم ذواتِ مقدّسہ سے شدید محبّت کو ظاہر کرتا ہے جسے ہم انشاء اللہ وضاحت کے ساتھ آپ کی خدمت میں پیش کریں گے۔

محبّت کی گفتگو ایک بحرِ بیکراں ہے اور اس ناپیدا کنار سمندر کے بارے میں بڑے بڑے عرفاء اولیاء اور علماء نے مختلف ادوار اور مختلف صدیوں میں ان ابواب کے علاوہ جنھیں انھوں نے اپنے

کتب اور رسائل میں قائم کیا ہے اور ہزاروں نکتے اور ہزاروں نئے مفاہیم پیش کئے ہیں، علیحٰدہ طور پر بھی بڑی عمدہ کتابیں تصنیف وتالیف کی ہیں کہ جنکا تذکرہ اس منزل پر ہمیں اپنے موضوع سے ہٹا دیتا ہے۔

اس شعر کی تفسیر میں جانے سے پہلے محبّت کے بارے میں دو ایک باتوں کا تذکرہ ضروری ہوجاتا ہے۔

محبّت کی اساس اور اس کے بنیادی سبب سے متعلق پہلی بات

جیسا کہ اس باب کے عنوان سے ظاہر ہے، ہم یہاں عشق و محبّت کی حقیقت اور ماہیت اور ان سے متعلق مسائل کے بارے میں بحث و تحقیق نہیں کرنا چاہتے اس لئے کہ یہ گفتگو بڑی تفصیل اور توجہ کی طالب ہے اور اس کے لئے ایک الگ وقت کی ضرورت ہے۔ اس باب میں صرف محبّت کی اساس اور اس کے اسباب کے بارے میں ایک مختصر گفتگو کو زیرِ بحث لایا گیا ہے اور ان بعض تعریفوں کو پیش کیا گیا ہے جنھیں عرفاء اور علماء کے ایک گروہ نے محبّت کے سلسلے میں قلمبند کیا ہے، اور یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ یہ تعریفیں زیادہ تر محبّت کے اوصاف اور اس کی نشانیوں پر مبنی ہیں اور علمی نقطہ نظر سے تعریف بہ معنیٰ تحدید نہیں اور ان پر تعریف کا اطلاق تعبیر میں ایک طرح

کا تناسب ہے۔

معلوم ہونا چاہیئے کہ محبّت کی جڑ بنیادِ محبوب کے کلمات کا ادراک اور اس کی معرفت ہے اور یہ بات اکابرین کی گفتگو کا خلاصہ اور نچوڑ ہے اگر انسان کسی بات کو درک نہ کرے اور ان کی معرفت نہ رکھے تو وہ کیونکر اسے چاہے گا، اور چونکہ محبّت، تابع درک اور معرفت ہے لہٰذا محبّت کے مراتب اور اس کی حد بھی ادراک کی حد اور اس کے مراتب کے مطابق ہوگی اور اسی سبب حضرت باری تعالیٰ کی نسبت معصومین صلوات اللہ علیہم کی محبّت بلند ترین سطح کی حامل ہے کیونکہ خدا کے نسبت ان کی معرفت اعلیٰ ترین مراتب کو اپنے اندر سمیٹے ہوئے ہے۔ جناب امیر المومنینؑ اور ان کے فرزندوں میں سے دیگر ائمہ طاہرین صلوات اللہ علیہم مناجاتِ شعبانیہ میں ارشاد فرماتے ہیں:

" وان ادخلتنی النار اعلمت اهلها انّی احبّک "

"اے میرے رب اگر تو مجھے آگ میں داخل کرے گا تو میں اہلِ دوزخ میں اعلان کروں گا کہ میرے دل میں تیری محبّت ہے۔

زیارت جامعہ میں ہم ان کی توصیف ان الفاظ میں کرتے ہیں: "التامین فی محبۃ اللہ" اور اس بات پر قرآن، احادیث اور اولیاء الٰہی کے شواہد کی بہتات ہے۔

شیخ الرئیس ابنِ سینا کی بات

« اجلّ مبتهج بشيء هو الاوّل بذاته؛ لأنّه أشدّ الأشياء ادراكاً لأشدّ الأشياء كمالاً الذى هو برئ عن طبيعة الإمكان والعدم و هما منبعا الشرّ؛ و لا شاغل له. »[1]

ترجمہ:

کسی چیز کے بارے میں انتہائی خوشی سب سے پہلے اپنی ذات سے نسبت رکھتی ہے اس لئے کہ وہ اس بلند ترین صاحبِ کمال کی نسبت بالاترین صاحب ادراک ہے کہ جو عدم وامکان کی طبیعت سے بری ہے، اور عدم وامکان، بدی کے دو سرچشمے ہیں، اور حق تعالیٰ کو اپنے ادراک میں روکنے اور مصروف رکھنے والا کوئی نہیں ہے۔

ایک عجیب حاشیہ

ہم یہ بتا چکے ہیں کہ محبّت، ادراک و معرفت کی تابع ہے اور یہیں سے اس شدید محبّت کے راز کا پتہ چلتا ہے جو جناب رسالتمآبؐ

۱: الاشارات والتنبیات ۳/ ۳۵۹۔

اور اُن کے اہلِ بیت اطہار علیہم السّلام کے درمیان تھا۔ یہاں اس عظیم مفہوم کی وضاحت کے لئے ہم ان اوراقِ پریشان کو چند ایک حدیث سے متبرک بناتے ہیں۔

اخطب خوارزم کے لقب سے مقلب موفق بن احمد خوارزمی کے جو علمائے اہلِ سنّت میں بڑے اونچے درجے پر فائز تھے اور فقیہ، محدّث اور خطیب سبھی کچھ تھے اپنی کتاب "مناقب" میں سند یافتہ علمائے اہلِ سنّت سے جن میں محمد بن جریر طبری ہیں۔ عبداللہ بن عمر سے روایت کرتے ہیں کہ انھوں نے کہا۔

«سمعت رسول اللہ صلّی اللہ علیہ و آلہ[1] وقد سئل: بای لغة خاطبک ربک لیلة المعراج؟ فقال: خاطبنی بلغة علی بن ابی طالب.[2] فألهمنی أن قلت: یا رب خاطبتنی انت ام علیّ؟[3]

۱: اس نورانی حدیث کو سیّد علی خان مدنی شیرازی۔ قدس سرہ نے ریاض السالکین کے ابتدا میں (اصل کتاب کو شروع کرنے سے پہلے) عجیب اسناد کے ساتھ روایت کیا ہے کہ جس میں تمام افرادِ اسناد، باپ اور بیٹے ہیں (اور وہ سب کے سب سیّد علی خان کے اجداد میں ہیں۔) سیّد کی روایت خوارزمی کی روایت سے الفاظِ حدیث کے اعتبار سے مختصر سا فرق رکھتی ہے جس کی ہم اپنے اپنے مقام پر نشاندہی کرتے رہیں گے

۲: سیّد کی روایت: بلسان علی۔

۳: سیّد کی روایت میں "انت" نہیں ہے۔

فقال: یا احمد؛ انا شییء لا کالأشیاء؛ [1] لا اقاس بالناس؛ و لا اوصف بالشّبهات؛ خلقتک من نوری؛ و خلقت علیاً من نورک؛ و اطّلعت [2] علی سرائر قلبک؛ فلم اجد فی قلبک احبّ الیک [3] من علی بن ابی طالب؛ فخاطبتک بلسانه کیما یطمئنّ قلبک.» [4]

ترجمہ:

جناب رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلّم سے لوگوں نے پوچھا: یا رسول اللہؐ! خداوندِ عالم نے شبِ معراج، آپ سے کس زبان میں گفتگو کی؟ آپؐ نے فرمایا: خداوندِ عالم نے اس رات مجھ سے علی کی زبان میں گفتگو کی؛ پس مجھ پر الہام کیا کہ میں اس سے پوچھوں۔ باری تعالیٰ تو نے مجھ سے خطاب کیا یا علیؑ نے؛ خدا نے فرمایا، اے احمد میں اور اشیاء کی طرح نہیں ہوں۔ اس پر لوگوں جیسا قیاس نہیں ہوتا۔ میں اشیاء کی تعریف میں نہیں آتا۔ میں نے تمھیں اپنے نور سے اور علیؑ کو تمھارے نور سے خلق کیا، میں نے تمھارے باطن میں نگاہ کی اور تمھارے دل کی گہرائی میں علیؑ سے زیادہ محبوب کسی اور شخص کو نہیں پایا

۱: سیّد کی روایت: "لیس کالاشیاء"

۲: سیّد کی روایت میں "اطلعت" واو کے بغیر آیا ہے۔

۳: سیّد کی روایت میں "الیک" نہیں ہے۔

۴: مناقب خوارزمی طسنگی ص ۴۷۔

پس میں نے علیؑ کی زبان میں گفتگو کی تاکہ تمہارا قلب مطمئن ہو۔

محبت کا عمل کہاں تک گیا ہے اور اس کا کیا مقام اور درجہ ہے کہ شاہ ولایت کی آواز، جناب سیّد کائنات اور سرور موجوداتِ قلب لطیف کے لیے باعث اطمینان ہوتی ہے۔

عزیز دوستو! یہ حدیث نورِ اسرار کا ایک سمندر ہے۔

این شرحِ بی نہایت کہ حسنِ یار گفتند
حرفیت کہ ہزاران اندر عبارت آمد
دریاست مجلس شاہ دریاب وقت ودریاب
ہان ای زبان کشیدہ گاہ تجارت آمد

۲: ابنِ حجر مکی کہ جو علماء اہلِ سنّت کے اکابرین اور تعصب میں مشہور ہیں رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ آپ نے جنابِ حسنین علیہم السلام کے بارے میں فرمایا:[۱]

«اللھم انی أحبھما فأحبھما و احبّ من یحبھما۔»

ترجمہ:

پروردگار میں اپنے ان دونوں فرزندوں کو دوست رکھتا ہوں پس تو بھی انہیں دوست رکھ اور ان کو بھی دوست رکھ جو انھیں دوست رکھے۔

۱: الصواعق المحرقہ ص ۸۲

۳: ابنِ اثیر جزوی کہ جو اعظم علماء اہلِ سنّت میں سے ہیں حضرت صدیقہ کبریٰ فاطمہ زہرا سلام اللہ علیہ کے بارے میں یہ روایت نقل کرتے ہیں اور کہتے ہیں۔

«کانت اذا دخلت علی النبیّ ـ صلی الله علیه و آله ـ قام الیهما فقبّلها و أجلسها فی مجلسه؛ و کان النبی ـ صلّی الله علیه و آله ـ اذا دخل علیهما قامت من مجلسها فقبّلته و اجلسته فی مجلسها.»[۱]

ترجمہ:

جب کبھی حضرت زہرا سلام اللہ علیہا جناب رسولؐ خدا کی خدمت میں حاضر ہوتی تھیں تو آپؐ ان کے احترام میں اپنی جگہ سے اُٹھ کھڑے ہوتے تھے اور ان کے ماتھے کا بوسہ لے کر اپنی جگہ بیٹھاتے تھے اور اسی طرح جب رسالتمآبؐ جنابِ سیدہؑ کی خدمت میں آتے تھے تو وہ اپنی جگہ سے اُٹھتی تھیں اور ادائے تعظیم میں انھیں چوم کر اپنی جگہ بیٹھاتی تھیں۔

۴: ابنِ اثیر پھر روایت کرتے ہیں اور کہتے ہیں:

«کان احب النساء الی رسول الله ـ صلی الله علیه و آله ـ فاطمة؛ و من الرجال علیّ.»[۲]

۱: جامع الاصول ۱۰/ ۸۶

۲: 〃 〃 ۱۰/ ۸۲

ترجمہ:

جناب رسولِ خدا صلّی اللہ علیہ وآلہ وسلّم کے نزدیک عورتوں میں سب سے زیادہ پیاری جناب زہراؑ اور مردوں میں سب سے زیادہ پیارے محبوب حضرت علیؑ تھے۔

۵: نیز یہ روایت بھی ابنِ اثیر ہی کی ہے۔ کہ جناب رسالتمآبؐ نے ایک لشکر روانہ کیا جس میں حضرت علیؑ بھی شامل تھے۔ پس لوگوں نے دیکھا کہ اپنے اپنے ہاتھ بلند کئے اور فرمایا:

«اَللّٰهُمَّ لا تُمِتْني حتى تريني علياً!»

"پروردگار جب تک علیؑ کو دکھا نہ دے اس وقت تک مجھے موت نہ دے۔"

اہلبیت علیہم السّلام کی زبان مبارک سے محب اور محبۃ اللہ کی توصیف میں

دوسری بات:

حضرت امام جعفر صادق علیہ السّلام ارشاد فرماتے ہیں:

ا: جامع الاصول ۹/۴۷۶

حضرت صادق ــ علیه السلام ــ فرمود: «حبّ الله إذا أضاء علی سرّ عبد أخلاه عن کلّ شاغل و کلّ ذکر سوی الله [الی أن قال]: و قال امیرالمؤمنین ــ علیه السلام ــ: حبّ الله نار لا یمرّ علی شیٔ الاّ احترق. [و قال علیه السلام أیضاً]: قال النبیّ ــ صلّی الله علیه وآله ــ: إذا أحب الله عبداً من أمّتی قذف فی قلوب أصفیائه و أرواح ملائکته و سکّان عرشه محبّته لیحبّوه فذلک المحبّ حقّاً طوبی له ثمّ طوبی له؛ و له عندالله شفاعة یوم القیامة. [1]

ترجمہ:

خداوند تبارک وتعالیٰ کی محبّت جب کسی بندے کے باطن کو روشن ومنوّر کرتی ہے تو اسے ہر مصروف بنانے والی شئے اور ہر یاد سے خالی کر دیتی ہے۔

آپؑ حضرت امیر المومنین علیہ السّلام سے نقل فرماتے ہیں کہ انھوں نے فرمایا خدا کی محبّت کسی چیز سے نہیں گزرتی مگر یہ کہ وہ چیز جَل جاتی ہے۔

رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وآلہ وسلّم نے فرمایا، جب خدا میری اُمّت میں سے کسی بندے کو چاہنے لگتا ہے تو اس کی محبّت کو ارواح، فرشتوں، برگزیدہ بندوں اور عرشِ مکینوں کے دل میں ڈال دیتا ہے تاکہ وہ انھیں چاہنے لگیں۔ پس ایسا شخص اللہ کا محبّ اور اس کا چاہتے

۱: فیضِ کاشانی: المحجۃ البیضاء ۸/۷

والا ہے، کیا کہنے اس شخص کے اور کیا بات ہے اس انسان کی، اور وہ یہ شخص ہے کہ جسے قیامت کے دن حقِ شفاعت حاصل ہے۔

نتیجہ

محبّت کی بحث میں گزشتہ تمہیدوں کے پیشِ نظر یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ "غم دلدار فکندہ است بجانم شرری" سے مُراد حضرت امیر المومنین علیہ السّلام سے نقل کی جانے والی حدیث کا وہی مضمون ہو جس میں آپؑ نے فرمایا تھا:

«حبّ الله نار لا يمر على شيء الا احترق»

اور "شہرہ بازار شدم" سے مُراد حدیثِ نبویؐ کا وہ مضمون ہو جس میں آپؐ نے فرمایا:

«قذف في قلوب أصفيائه و أرواح ملائكته و سكّان عرشه ليحبّوه»

اس لئے کہ جب تک کوئی بندہ حقیقی معنوں میں) اللہ کا محبّ نہیں ہوتا، ارواحِ ملائکہ سکّانِ عرش اور اصفیاء کے قلوب کا محبوب نہیں ہوتا اور شہرۂ بازار نہیں بنتا۔ پس درحقیقت پہلے مصرعہ کا مضمون اور دوسرے مصرعے کا مضمون ایک دوسرے کے لئے لازم و ملزوم ہیں۔

شاید "المحبة نار تحرق ما سوی المحبوب" کہنے

والے نے پہلی حدیث سے یہ مضمون لیا ہو۔

عارف اور ادیب کے بارے میں ایک عجیب گوشہ

"شہرۂ بازار شدم" کا جملہ بڑے دقیق و لطیف پہلو کا حامل ہے، جب محبت بڑھ جاتی ہے اور محب کی روح شرر بار کرتی ہے تو اس کا چھپانا مشکل ہو جاتا ہے اور اس بات کا خوف پیدا ہو جاتا ہے

"کہ از پردہ بروں افتد راز"

"شیخ اشراق" کے نام سے شہرت پانے والے شیخ شہاب الدین سہروردی نے کہ جنھیں ۵۸۷ ہجری میں قتل کیا گیا اس سلسلے میں کچھ اشعار کہے ہیں کہ جنھیں ہم اس منزل پر اہلِ عرفان و ادب سے تعلق رکھنے والے اہلِ دل حضرات کے حریم قلب میں بہ رسم ہدیہ و تحفہ پیش کرتے ہیں۔

أبداً تحن إليكم الأرواحُ
و وصالكم ريحانها و الرّاحُ
و قلوب أهل و دادكم تشتاقكم
و الی لذيذ لقائكم ترتاحُ
«و ارحمةً للعاشقين تكلّفوا
ستر المحبّة والهوى فضّاحُ»

بالسرّإن باحوا تُباح دماؤهم
و كذا دماء البائحين تُباحُ
وَ إذا هم كتموا تحدّث عنهُم
عندالوشاة المدمعُ السّفّاحُ
و بدت شواهد للسّقام عليهم
فيها لمشكل أمرهم إيضاحُ

خفض الجناح لكم و ليس عليكُم
للصّبّ فى خفض الجناح جناحُ
فإلى لقاكم نفسه مرتاحة
و إلى رضاكم طرفه طمّاحُ
عودوا بنور الوصل من غسق الجفا
فالهجر ليل و الوصال صباحُ
صافاهُم فصفو اله فقلوبهم
فى نورها المشكاة والمصباحُ
و تمتّعوا فالوقت طاب بقربكم
راق الشّراب و رقّت الأقداحُ
يا صاحِ ليس على المحبّ ملامةٌ
إن لاح فى أفق الوصال صباحُ
لا ذنب للعشّاق إن غلب الهوى
كتمانَهم فنما الغرام و باحُوا

سمحو بأنفسهم و ما بخلوابها
لمّا دَروا أنّ السماح رباحُ
و دعاهُم داعى الحقائق دعوة
فغذ و ابها مستأنسين و راحوا
ركبوا على سنن الوفا فدموعهم
بحر و شدّة شوقهم ملاّحُ
واللهِ ما طلبوا الوقوف ببابه
حتى دُعوا و أتاهم المفتاحُ

لا يطربون بغير ذكر حبيبهم
أبداً فكّل زمانهم أفراحُ
حضروا و قد غابت شواهد ذاتهم
فتهتّكوا لمّا رأوه و صاحُوا
أفناهُم عنهم و قد كشفت لهم
حجب البقا فتلاشتِ الأرواحُ
فتشبّهوا إن لم تكونوا مثلهم
إن التّشبّه بالكرام فلاحُ
قم يا نديم إلى المدام فهاتِها
فى كاسها قد دارت الأقداحُ

من كرم إكرام بدنّ ديانة
لا خمرة قد داسها الفلاّحُ[1]

دوسری تفسیر

جیسا کہ پہلے شعر کی تفسیر میں آیا ہے کہ یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ "غمِ دلدار" سے مُراد وجہ اللہ حضرت ولی امر صلوات اللہ علیہ وآلہ وعلی آبائہ الطاہرین کی زیارت کے اشتیاق کی شدّت ہو، حضرت امام رضوان اللہ تعالیٰ علیہ جیسی ہستیوں کی زبانِ حال یہ جملے ہیں:

«لیت شعری این استقرّت بک النّوی؛ بل أیّ ارض تقلک اوثری؛ ابرضوی ام غیرها أم ذی طوی، عزیز علیّ ان اری الخلق و لا تری؛ و لا اسمع لک حسیساً و لا نجوی.»

۱: ان اشعار کو ہم نے ابنِ خلکان کی تالیف "وفیات الاعیان" ۲۷۱/۶ سے نقل کیا ہے۔ البتّہ یہ اشعار دوسری کتابوں میں بھی مکمل یا نامکمل طور پر پائے جاتے ہیں لیکن میرا خیال ہے کہ ان اشعار کا صحیح ترین نسخہ یہی ہے جسے ہم نے اہلِ عرفان سے تعلق رکھنے والے عشاق کی خدمت میں پیش کیا ہے، ہمارے خیال کی ایک دلیل یہ بھی ہے کہ وہ "وفیات" جسے ہم نے چھاپا ہے تمام نسخوں میں صحیح ترین نسخہ ہے۔

میرا خیال تھا کہ میں ان اشعار کو ترجمہ کے قالب میں لاؤں لیکن جب میں نے ان کے مضامین پر غور کیا تو میں نے دیکھا کہ اس کا ترجمہ مٹھی بھر مبہم مفاہیم کے سوا کچھ بھی پیش نہیں کرے گا اور ترجمہ سے اس کا حق ادا نہیں ہوگا۔ اور اس کے لئے ایک دقیق علمی شرح کی ضرورت ہوگی کہ جو خود ایک مستقل رسالہ بن جائے گا لہٰذا میں نے اس سے صرفِ نظر کیا؛ ضمناً گزارش ہے کہ گزشتہ کی تمہیدی باتیں آپ کے ذہن میں رہیں۔

رندانِ تشنہ لب جامی نمی دھد کس
گوئی ولی شناسان رفتند ازین ولایت
دراین شب سیاہم گم گشت راہ مقصود
از گوشۂ برون آی ای کوکب ہدایت
ای آفتاب خوبان می جوشد اندرونم
یک ساعتم بگنجان در سایۂ حمایت

تبصرہ

یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ خدا، اولیاء صلحاء کی محبت اور اعمال صالحہ کی محبت سبھی کی ایک سنخ اور ایک جنس ہے۔

ایک عظیم اور اعلیٰ نکتہ

بنیاد یہ طے پائی تھی کہ تمام خلقِ خدا، حقِ سبحانہ اللہ تعالےٰ کے محب ہوں۔

حضرت سید الساجدین فخر العابدین علی بن الحسین صلوات اللہ علیہ صحیفۂ سجادیہ کی پہلی دعا میں ارشاد فرماتے ہیں:

"وبعثهم فی سبیل محبتہ"[1]

لیکن لوگوں نے سرمایوں پر پانی پھیر دیا کہ جس پر ان سے کہا جائے گا۔

"اذھبتم طیباتکم فی حیاتکم الدّنیا"[2] فافھم۔

۱: سید اجل سید علی خان مدنی شیرازی اعلی اللہ مقامہ نے صحیفہ سجادیہ کی شرح میں کہ جس کا نام انھوں نے (ریاض السالکین) رکھا ہے۔ ضمیر کی طرف محبت کی اضافت کو مفعول کی طرف مصدر کی اضافت جانا ہے۔

۲: احقاف: ۲۰

قال الامام المجدد۔ اعلیٰ اللہ مقامہ السامی

در میخانہ کشائید بر ویم شب و روز
کہ من از مسجد و از مدرسہ بیزار شدم

چونکہ اس شعر کے مفردات و الفاظ لغوی اور شعری اعتبار سے صاف اور واضح ہیں۔ اس بارے میں اس بات کو طول دینا مناسب دکھائی نہیں دیتا:

عرفانی تفسیر پر تمہید

البتہ ان پریشان اوراق کو پڑھنے اور مطالعہ کرنے والوں کا مقام

اس سے بلند ہے کہ یہ حقیر مُٹھی بھر صاف اور واضح مطالب کے بارے میں ان سے عرض مدعا یا ان کی وضاحت کرے؛ لیکن کیا کروں جس طرح کہ گذشتہ ابواب میں، میں نے عرض کیا تھا "نادان انسان سے بات نکالتا ہے"، پس یہاں میرا روی سخن اہلِ فضل اور اہلِ معارف وادب سے نہیں ہے۔ میں اس تمہید کو عام مومنین کے قلوب میں بعض شیاطین کے امکانی وسوسہ کی پیش بندی کی خاطر تحریر کر رہا ہوں۔

حضرت امام رضوان اللہ علیہ کے عشق میں سرشار میرے صالح مومن دوست جان لیں کہ ہر فن سے وابستہ افراد کی ایک خاص زبان اور خاص طرح کی اصطلاحیں ہوتی ہیں۔ ہر علم اپنے سے متعلق خاص اصطلاحوں کا حامل ہوتا ہے اور جو شخص اس علم یا فن سے وابستہ نہیں ہوتا وہ اس کے اصطلاحوں کو نہیں سمجھ سکتا اور ان سے احیاناً غلط قسم کے مفاہیم اخذ کر کے اس علم یا فن سے وابستہ لوگوں پر بے جا تہمتیں اور ناروا الزامات عائد کرتا ہے۔ اسی زبان اور اصطلاحات کی بے خبری نے تاریخ کے گزرتے ہوئے لمحات میں نہ جانے کتنی ہستیوں پر تکفیر کے تازیانے برسائے اور آئندہ بھی برساتا رہے گا!

۱: البتہ فیصلہ کی بنیاد حدِ اعتدال میں شرعی اور عقلی میزان پر ہونی چاہیئے (شرع اور عقل ہر جگہ ایک دوسرے کے مطابق ہیں۔ الشرع عقل من خارج والعقل شرع من داخل) اس بات کا

اس بات کو مدِ نظر رکھنا چاہیئے کہ اکابرین کے اصطلاحات سے غلط فائدہ اُٹھانے والوں کی دو جماعتیں ہیں

پہلی جماعت:

ان خشک قسم کے بے علم و بے خبر مقدس نما لوگوں کا ہے کہ جو کچھ نہیں جانتے، اور نہیں جانتے کہ نہیں جانتے اور یوں ہی جہل مرکب میں پڑے رہتے ہیں، خاص طور پر اگر وہ دو ایک عربی الفاظ یا چند علمی اصطلاحات جان گئے تو پھر قیامت ہے، اسلام اور معارفِ اسلامی کے لئے اس جماعت کا وجود بہت خطرناک اور انتہائی ضرر رساں ہے، یہ لوگوں

یہ مطلب نہیں ہے کہ ہر کوئی، اہلِ فن کے عنوان سے جو کچھ کہے ہم آنکھ بند کر کے اسے تسلیم کر لیں اور کہیں: سچ کہتا ہے یقیناً بات ہماری سمجھ سے باہر ہے۔

ملاصدرا کے نام سے مشہور اسلام کے ایک عظیم فلسفی صدرالمتالھین نے جو فلسفہ میں ایک عظیم مقام رکھنے کے علاوہ عرفاء کے حلقے میں بھی اونچے درجہ پر فائز ہیں اپنی کتاب "کسر اصنام الجاھلیہ" میں عارف نما لوگوں کی بعض لفّاظیوں پر شدید نکتہ چینی کی ہے اور عرفان و تصوف کے مدعیوں کے جاہلانہ تاویلات کو شرعاً حرام جانا ہے اور ان پر تنقید کی ہے۔

پس اگر کوئی اہلِ فن ہو اور متعلقہ علم میں مہارت رکھتا ہو تو اس کے لئے کوئی دشواری نہیں اور اگر ایسا نہیں تو پھر خاموش رہنا ہوگا اور ایسے اہلِ فن سے رجوع کرنا ہوگا کہ جو اس میں مہارت رکھتا ہو۔

کو اسلام کی عظمت کے ادراک اور حضرت سیّد المرسلین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شریعت کی حقیقت اور اس کی روح کو سمجھنے سے باز رکھتے ہیں۔ یہ کہانی بڑی لمبی ہے اور اس کے لئے ایک الگ کتاب کی ضرورت ہے۔

دوسری جماعت

ان شیطان صفت، جاہل اور مادر پدر آزاد لوگوں کی ہے جو بزرگوں کے جُملوں سے کھیلتے ہیں اور جب کسی کو گمراہ کرنا چاہتے ہیں اور اکابرین سے انھیں منحرف کرنا چاہتے ہیں تو ان کے الفاظ کو غلط رنگ دیتے ہیں کبھی ان کے الفاظ اور اصطلاحات کو دستاویز اور بہانہ قرار دے کر اپنی آزادی اور بے راہ روی کے لئے سَند مہیّا کرتے ہیں اگر کوئی بڑی قابلِ احترام ہستی اپنے شعر میں "مئے" اور "میکدہ" جیسے الفاظ استعمال کرتے ہیں تو معاذ اللہ اس سے اس کی مُراد حقیقی شراب یا واقعی میخانہ نہیں ہوتا اور یہی صورت "از مسجد بیزار شدم" اور اس جیسے الفاظ اور اصطلاحات کی بھی ہے۔ بلکہ بعض اکابرین نے اس بات کی تصریح کی ہے کہ ان الفاظ سے ان کی مُراد ان کے حقیقی اور لغوی معنے نہیں ہیں، سہروردی اپنے ان اشعار میں جنھیں ہم ان سے نقل کر چکے ہیں کہتے ہیں:

قم یا ندیم الی المدام فھاتھا
فی کاسھا قد دارت الأقداح

من کوم إکوام بدنّ دیانة

لاخمرة قد داسها الفلاّح

ان کے اشعار کا مفہوم یہ ہے کہ میں شراب، دیانت کی صراحی سے چاہتا ہوں حقیقی صورت میں نہیں۔

یا پھر مُلّا احمد نراقی مرحوم کہ جو ایک پایہ کے فقیہ، اونچی سطح کے عارف اور اخلاقی بزرگ ہیں اور اپنے ولولہ انگیز اشعار میں اپنا تخلص "صفائی" کرتے ہیں اپنے اشعار میں "مے" اور "میخانہ" جیسے الفاظ بڑی فراوانی سے لاتے ہیں اور بعض میں ان الفاظ سے اپنے مقصد کی تصریح کرتے ہیں، ان کے ولولہ انگیز اشعار کا ایک نمونہ یہ ہے:

ساقی بیاد یار بدہ ساغری زمی

از آن گنہ چہ باک کہ باشد بیاد وی

من ژندہ پوش یارم و دارم بجان او

ننگ از قبای قیصر و عار از کلاہ کی

شرمم ز فقر باد مقابل کنم اگر

با گنج فقر شہر صفاهان و ملک ری

تا کی دکا بمدرسہ طامات ترّہات

بشنو حدیث یار دو روزی زنای نی

واعظ مگو حدیث بہشت و قصور و حور
ما تو سن ہوا و ہوس کردہ ایم پی
ما عندلیب گلشن قدسیم باغ ما
ایمن بود ز باد خزان و ھوا می دی
زاہد بروچہ طعنہ مستی زنی کہ ہست
مست از خیال دوست صفائی نہ مست می[1]

تفسیرِ عرفانی

صاحبِ کشاف کہتے ہیں:

"میخانہ سے مُراد عارفِ کامل کا باطن ہو سکتا ہے کہ جس میں ذوق و شوق اور الٰہی عوارف کی کثرت ہوتی ہے۔"[2]

یہ حقیر کہتا ہے:

اس قاصر کی نظر میں میخانہ سے مُراد وہ کثرت تجلّیات ہو سکتی ہیں کہ جسے پہلے شعر کی تفسیر میں مختصراً عرض کیا جا چکا ہے۔ یہ تجلّیات شروع شروع میں سالک پر جم کر نہیں رہتیں بلکہ آتی جاتی رہتی ہیں پھر آہستہ آہستہ اس میں طمانیت پیدا ہوتی ہے اور یہ وہی مقامِ وصول ہے کہ جس کا تذکرہ عرفاء کی اصطلاح میں دیکھنے میں آتا ہے۔

۱۔ خزائن ص ۲۱۹۔ آخری شعر میں تصریح ہے۔ ۲۔ ج ۲ ص ۱۵۶۳ ط کلکتہ۔

اس تفسیر کی بنیاد پر، مسجد اور مدرسہ سالک کے قبل از ارادہ کیفیت سے متعلق کنایہ ہے کہ جو دھاگہ کے سرے کو پانا چاہتا ہے، اور چونکہ وہ کیفیات (یعنی قبل از ارادہ والی کیفیات) ذاتی مطلوبیت کی حامل نہیں بلکہ مطلوب بالعرض تھیں اس لئے "بیزارم" کا لفظ ان کے مطلوب بالعرض ہونے سے کنایہ ہوگا۔

واللہ اعلم بضمائر عبادہ[1]

شعر کے تفسیر کی دوسری تعبیر

یہ بات بھی کہی جا سکتی ہے کہ روحِ کلام یہ ہے کہ میخانہ سے مُراد قُربِ نوافل کا مقام ہو، اس مقام پر عبادات، روح اور حقیقت کے ساتھ مکمل طور پر آغشتہ ہیں کہ جو حضرتِ حق جلت عظمتہ کی نسبت عبد کی مُحبّت کے زیرِ اثر ان کا شفیّت سے اور ان عبادات کی نسبت اس محبّت کے مکشوف عنہ ہونے سے عبارت ہے۔ جیسا کہ ہم نے گذشتہ میں عرض کیا اس مقام کا حصول، قندیلِ ولایت سے کسبِ نور اور طلبِ استعانت کے بغیر ممکن نہیں؛ کیا کہوں اس سادہ لوح بیچارے کے بارے میں کہ جو صرف عبادات کی بعض عبادات کو دیکھ کر جی خوش کرتا ہے۔ اور کا شفیت عبادات اور مصباحِ ولایت

۱: بعض افراد کا کہنا ہے کہ مسجد اور مدرسہ قوم کی زبان میں قیود اور تعلق سے عبارت ہے۔

سے کسبِ نور کے دو شرائط میں غفلت کا شکار ہوتا ہے اور ان کی معیت کے بغیر قدم اُٹھاتا ہے؛ کہ "لا یزیدہ السیر الا بعداً"

گر انگشتِ سلیمانی نباشد
چہ خاصیت دھد نقشِ نگینی

اس مقام کو پانے کے بعد، اہلِ بیتؑ وحی و عصمت صلوات اللہ علیہم کے معتبر روایات کے مطابق حق سبحانہ تعالیٰ بندہ کی آنکھ اور اس کے کان بن جاتا ہے۔ یہ چشم و گوش دیکھنے اور سُننے کے لئے ہیں۔ اس سے زیادہ کس بات میں لطف ہے کہ انسان ان آنکھوں سے دیکھے اور ان کانوں سے سُنے؟

پس اچھی طرح جان لو کہ بنیاد محبّت ہے اور میخانہ سے مُراد یہی محبّت اور اس کے ثمرات ہیں کہ جو شوق اور ذوق اور وجد و ولولہ سے عبارت ہے اب خواہ وہ بہ اعتبار ہدایت ہو یا بہ اعتبار نہایت، وصول، "قرب نوافل" میں یہ تمام چیزیں چھپی ہوئی ہیں اور اس کی انتہا دیکھنے اور سُننے پر ہوتی ہیں۔ اور اسی میں لذّت تمام اور شُربِ مدام کا لُطف آتا ہے۔

اس تفسیر کی بنیاد پر "مسجد اور مدرسہ" کی تفسیر میں دو[۲] باتیں تصوّر کی جاسکتی ہیں۔

پہلی بات یہ ہے کہ "مسجد و مدرسہ" سے مُراد مذکورہ شرائط

سے عاری عبارتیں اور لاحاصل قیل وقال ہو۔

اور دوسری بات جیسا کہ ہم پہلے بھی اشارہ کر چکے ہیں "ارادہ" سے پہلے والی ابتدائی امر کی تمہیدات مقصود ہوں کہ جن میں سے بعض "موصل" ہوں اور بعض نہ ہوں اور "بیزارم" کا لفظ ان سے مستغنی ہونے پر کنایہ ہو۔

مدرسہ سے بیزاری کے بارے میں ایک اور مستقل تفسیر[1]

گذشتہ میں اشارہ کیا جا چکا ہے کہ جاہل اور قاصر الفہم بے خبر لوگ بزرگوں کی باتیں نہیں سمجھتے اور انہیں تعریف کر کے اپنا خود ساختہ مفہوم پہناتے ہیں اور ان کے مقصد کو سمجھے بغیر ان کی تقلید میں ان کے الفاظ خرچ کرتے ہیں۔

اس منزل پر ہم اپنے موضوعِ بحث سے متعلق ایک مثال سلمنے لاتے ہیں تاکہ خداوندِ عالم کے فضل سے بات واضح ہو جائے۔ مثلاً وہ دیکھتے ہیں کہ شیخ بہائی فرماتے ہیں:

علم رسمی سر بسر قیل است وقال
نہ از آن کیفیتی حاصل نہ حال

۱: یہ حصّہ جملہ عوام کے لئے خاص طور پر دینی طلباء کے لئے بڑی اہمیت کا حامل ہے۔

علم نبود غیرِ علم عاشقی
ما بقی تلبیس ابلیس شقی
ایھا القوم الذی فی المدرسۃ
کلما حصلتموہ وسوسہ

یا پھر یہ کہ:

تا کی ز شفا[1] شفا طلبی
وز کاسۂ زہر دوا طلبی

یا پھر حافظ کو یہ کہتے ہوئے دیکھتے ہیں کہ:

بشوی اوراق گر ہمدرس مائی
کہ علم عشق در دفتر نباشد

بے خبر اور کم علم لوگ؛ اور کبھی صاحبِ غرض افراد بھی؛ اس طرح کی باتوں سے غلط فائدہ اُٹھا کر اسے دوسروں پر لوٹاتے ہیں اور اس طرح کے اشعار اور مضامین کے علاوہ کبھی بعض عرفاء کے حالات سے دلچسپ حکایتیں بھی تذکرہ نگاروں سے نقل کرتے ہیں اور اپنی باتوں اور اپنے استدلال کو ان سے رونق بخشتے ہیں، ان حکایتوں میں ایک داستان شمس تبریز اور مولانا کی ہے جسے جامی نے اس طرح نقل کیا ہے" اور بعض افراد نے کہا ہے کہ جب شمس الدین مولانا کی خدمت

۱: اس سے مراد شیخ ابنِ سینا کی کتابِ شفا ہے۔

میں قونیہ پہنچے تو اس وقت مولانا ایک حوض کی منڈیر پر بیٹھے ہوئے تھے اور ان کے پاس کچھ کتابیں رکھی ہوئی تھیں۔ شمس الدین نے پوچھا کہ یہ کیسی کتابیں ہیں؟ مولانا نے کہا انھیں قیل وقال کہتے ہیں مگر تم کیوں پوچھ رہے ہو؟ شمس الدین نے جواب دیئے بغیر ہاتھ اُٹھا کر تمام کتابیں پانی میں ڈال دیں، مولانا کو بڑا دکھ ہوا اور بڑے افسوس سے کہا: اے درویش یہ تم نے کیا کیا، ان میں سے بعض کتابیں میرے والد کے افادات سے تھیں اور اب ان کا ملنا محال ہے۔ اتنے میں شمس الدین نے پانی میں ہاتھ ڈال کر ایک ایک کتاب باہر نکالی۔ پانی نے کسی کتاب کو کوئی نقصان نہ پہونچایا تھا۔ مولانا نے حیرانی سے پوچھا "یہ کیا راز ہے"؟ شمس الدین نے کہا کہ یہ وجد و حال ہے تمھیں اس کی کیا خبر؟ تم اسے کیا جانو؟ اور پھر اس کے بعد ان دونوں میں گفتگو کا سلسلہ شروع ہوا۔[1]

اب ان کج فہموں اور غلط انداز سے فائدہ اٹھانے والوں سے ہٹ کر بعض افراد جناب امیر المومنین علیہ السّلام کے اس قول کے مصداق کہ "کلمۃ الحق یراد بھا الباطل"، بزرگوں کے الفاظ سے غلط بات کو فروغ دیتے ہیں، اب ہم دیکھتے ہیں "علم رسمی سربسر قیل است وقال"، جیسے جملوں یا "علم عشق در دفتر نباشد"، کے ضمن میں خود بزرگوں کی سوچ کیا ہے؟

۱: نفحات الانس مطبوعہ تہران۔ ص ۴۶۶

اس ٹکڑے کی وضاحت کے لئے ہمیں چاہیئے کہ ہم اس مفہوم کو بڑی توجہ سے سمجھیں:

بلند و بالا الٰہی معارف تک پہنچنے کے بارے میں دو طرح کے نظریات پائے جاتے ہیں

طویل عرصے سے اسلامی دانشوروں اور اہلِ معارف کے دو گروہوں کے درمیان (کہ جنھیں عقلی اور شہودی گروہوں سے بھی تعبیر کیا جاتا ہے) یہ بحث چلی آرہی ہے کہ نفس ناطقہ کی تکمیل اور بلند و بالا الٰہی معارف تک پہنچنے کے لئے کس راہ کو طے کرنا ہوگا؟ اس منزل پر دو طرح کے نظریات پائے جاتے ہیں:

الف: استدلال اور نظریات کا طریقہ

ب: ریاضات اور مجاہدات کا طریقہ

محقق جرجانی "شرح مطالع" کے حواشی میں لکھتے ہیں:

«اعلم أنّ السعادة العظمى والمرتبة العليا للنفس الناطقة؛ هى معرفة الصانع بما له من صفات الكمال المنزّه عن النقصان و بما صدر عنه من الآثار والأفعال فى النشأة الاولى والاخرة؛ و بالجملة معرفة المبدء والمعاد. والطريق

الی هذه المعرفة من وجهین:

احدهما: طریق اهل النظر والإستدلالات. و ثانیهما: طریق اهل الرّیاضة و المجاهدات.

و السّالکون للطّریقة الأولی ان التزموا ملّة من ملل الأنبیاء-علیهم السلام-؛ فهم المتکلّمون؛ و الّا فهم الحکماء المشّاؤن.

و السّالکون للطّریقة الثّانیة ان وافقوا فی ریاضاتهم احکام الشّریعة؛ فهم الصّوفیّة المتشرّعون؛ و الّا فهم الحکماء الإشراقیّون. فلکل طریقة طائفتان.»

ترجمہ:

واضح رہے انسانی نفسِ ناطقہ کے لئے سب سے بڑی سعادت اور سب سے اونچا مرتبہ خداوندِ تبارک وتعالیٰ کی شناخت ہے کہ جس میں وہ صفات سلبیہ سے منزہ صفاتِ کمال کا حامل ہوں، اور دنیا وآخرت میں جو کچھ بھی اس سے متعلق افعال وآثار صادر ہوتے ہیں وہ بھی اس میں شامل ہوں، اور اس کا خلاصہ یہ ہے کہ انسان مبدٔ ومعاد کو پہچانے اور اس پہچاننے کی دو راہیں ہیں ایک اہلِ نظر و استدلال کی راہ اور دوسرے اہلِ ریاضت ومجاہدت کا طریقہ، پہلی راہ کے سالک اگر متدّین اور پیغمبرانِ الٰہی کے ادیان میں سے کسی دین پر ہوں تو وہ متکلم ہوں گے وگرنہ مشاؤن کہلائیں گے۔

دوسری راہ کے سالک اگر اپنی ریاضتوں میں احکامِ شریعت

کے پابند ہوں تو وہ شریعت کے پابند صوفی کہلائیں گے[1] وگرنہ انہیں حکماء اشراقی کہا جائے گا۔ پس ان دو راہوں میں سے ہر راہ کی دو قسمیں ہیں اور دو ہی اس کے ماننے والے گروہ ہیں۔

دوسرے نظریہ کے حامل افراد کی گفتگو کا مدعا

اس باب کے آغاز میں میرے تمام پڑھنے والے احباب چند نکتوں پر اپنی توجہ مرکوز فرمائیں:

۱۔ اس بات کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے کہ ہماری گفتگو کا مزاج اس مختصر کتاب میں دوسرے نظریہ سے متعلق ہے لہٰذا ہم پہلے نظریہ کی بحث میں پوری طرح وارد نہیں ہوں گے۔

۲۔ دوسرے نظریہ سے متعلق لوگوں سے مراد اسی کے معتدلین ہیں۔

۱: مسلمہ امر یہ ہے کہ دُنیا عرفاء کے لئے خلق ہوئی ہے اور حقیقی عرفاء اہلِ بیتؑ وحی و عصمت صلوات اللہ علیہم کے سچے پیرو ہیں۔ خدا کا بندہ بے نام و نشان ہوتا ہے، نام و نشان کی کوئی اہمیت نہیں ہوتی "ان ھی الا اسمائٌ سمیتموھا انتم و آباؤکم" سیر و سلوک سے مُراد نام و نشان اور تشخیص و تقلید کو دور پھینکنا ہے۔ اس کے قید میں اسیر ہونا نہیں ہے۔

۳ ـــــــ اس گفتگو میں ہم عقلِ جزئی سے عرفاء کے ٹکراؤ، عشق وعقل کے تقابل اور ان سے متعلق مسائل سے نہیں الجھیں گے۔

اب ہم اصل موضوع کی طرف لوٹتے ہیں۔ بات دوسرے نظریہ کے حامی افراد کی گفتگو اور ان کے ہدف یعنی طریقہ ریاضت و مجاہدت کی ہے۔

مولانا روم فرماتے ہیں:

پای استدلالیان چوبین بود

پای چوبین سخت بی تمکین بود[1]

اس شعر کے کہنے والے کا تعلق دوسرے نظریہ کے شہرت یافتہ افراد میں سے ہے اور اس کا شمار عالمِ اسلام کے عظیم دانشوروں میں ہوتا ہے اور اس کا یہ شہرۂ آفاق شعر طریقۂ ریاضت و مجاہدت کے طرفداروں میں ان کی زبان کی حیثیت رکھتا ہے اور اُن کے مقصد اور مدعا کا عنوان بنا ہوا ہے۔

انسان فطرتاً برھان واستدلال کا پابند ہے، یعنی فطرت اسے دلیل کے مقابل جُھکا دیتی ہے

" فطرة الله التی فطر الناس علیها لا تبدیل لخلق الله "[2]

بقولِ عالی مقام علامہ طباطبائی قدس اللہ لطفہ واجزل تشریفہ، کے

۱: مثنوی مطبوعہ کلالۂ خاور۔ دفترِ اوّل۔ صفحہ ۴۴۔

۲: سورۂ روم آیت ۳۰

"انسان اپنے فطری علوم کو باطل نہیں کر سکتا"۔ انسان سے غلطی سرزد ہوتی ہے۔ وہ منحرف اور سرگرداں بھی ہوتا ہے لیکن یہ بات ابطالِ حکم فطرت میں نہیں آتی۔ یہ عمل کبھی ابطالِ حکم فطرت میں نہیں آتی۔ یہ عمل کبھی ہوائے نفس کی پیروی میں رو بعمل آتا ہے، اور کبھی تطبیق میں اشتباہ اس کا سبب ہوتا ہے۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ کیا مولانا روم جیسی صاحبِ علم ہستی فطرت کی آواز کی مخالفت کر سکتی ہے؟ اور پھر کیا واقعی برہان و استدلال اُن کے نزدیک کوئی وقعت نہیں رکھتے؟ کیا مولانا علم کے مخالف ہیں؟ پھر کیوں کہتے ہیں:

خاتم ملک سلیمان است علم
جُملہ عالم صورت و جان است علم

آدمی را زین ہمہ بیچارہ گشت
خلق دریاھا و خلق کوہ و دشت

یا پھر ان کا یہ شعر کہ:

علم دریائی است بی حد و کنار
طالب علم است غواصِ بحار

یا شیخ بہائی کی یہ بات کہ: ع

"علم رسمی سر بسر قیل است و قال"

تو کیا وہ مدرسہ، درس اور کتاب کے مخالف تھے؟ اگر ایسا ہے تو پھر ان کی یہ "کشکول"، "مشرق الشمسین" اور "صمدیہ" وغیرہ جیسی تالیفات کیا ہیں؟

امام ہی کو لیجئے کہ جن کی تمام عمر حصولِ علم اور فقہ و اصول[1] اور فلسفہ و کلام کی کتابیں لکھنے میں گزریں پھر کیوں کہتے ہیں:

ع: "از مسجد و مدرسہ بیزار شدم"

۱: حضرت امام خمینی قدس اللہ سرہ "دعای سحر" کی شرح (مطبوعات بیروت ص ۷۳) میں ارشاد فرماتے ہیں۔

" لا یذهبن بنور عقلک الشیطان، و لا یلتبس علیک الامر حتی تقع فی الخذلان، فان الشیطان یوسوس فی صدور الناس باختلاط الحق بالباطل، و الصحیح بالسقیم، فربما یخرجک عن الطریق المستقیم بصورة صحیحة و معنی سقیم فیقول: ان العلوم الظاهریة و الاخذ بکتب الظاهریة (کذا) السماویة لیس بشی و خروج عن الحق، و العبارات (ظ: العبادات) القالبیة و المناسک الصوریة مجعولة للعوام کالانعام و اهل الصورة و اصحاب القشور. و اما اصحاب القلوب و المعارف فلیس لهم الا الاذکار القلبیة و الخواطر السریة التی هی بواطن المناسک و نهایتها، و روح العبادات و غایتها، و ربما ینشد لک و یقول،

علم رسمی سر بسر قیل است و قال — نه از او کیفیتی حاصل نه حال
علم نبود غیر علم عاشقی — ما بقی تلبیس ابلیس شقی

الی غیر ذلک من التلبیسات و التسویلات. فاستعذ منه بالله و قل له: أیها اللعین، هذه کلمة حق تزید بها الباطل، فان الظاهر المطعون هو الظاهر المنفصل عن الباطن و الصورة المنعزلة عن المعنی، فانه لیس بکتاب و لا قرآن، و اما الصورة المربوطة بالمعنی، و العلن الموصول بالسر فهو المتبع علی لسان الله و رسوله و اولیائه علیهم السلام، کیف و علم ظواهر الکتاب و السنة من اجل العلوم قدراً و ارفعها منزلة، و هو اساس الاعمال الظاهریة و التکالیف الالهیة و النوامیس الشرعیة و الشرائع الالهیة و الحکمة العملیة التی هی الطریق المستقیم الی الاسرار الربوبیة و الانوار الغیبیة و التجلیات الالهیة، و لو لا الظاهر لما وصل سالک الی کماله، و لا مجاهد الی مآله."

جواب

یہ ایک مُسلمہ امر ہے کہ جن ہستیوں کے نام ہم نے بطورِ مثال لیئے وہ ہرگز ہرگز علم، عقل، استدلال اور برہان کے مخالف نہیں، اس لئے کہ منطق اور برہان کی مخالفت حکمِ فطرت کو باطل کرتا ہے اور یہ بات جیساکہ ہم پہلے اس کی طرف اشارہ کر چکے ہیں کہ محال اور انسان کے بس سے باہر ہیں۔ یہاں تک کہ معاصرین وغیرہم سے تعلق رکھنے والے اہلِ عرفان میں سے بعض بزرگوں اور شہودی اور کشفی عرفان کے حامیوں اور محققین نے بھی اس بات کی تصریح کی ہے کہ معلوم بہ کشف اور معلوم بہ برہان میں کوئی فرق نہیں ہے اگر ہے تو اس کے ظہور اور خفا میں ہے اور یہی کہا ہے کہ، صاحبِ کشف کا کشف سے پہلے متکلم یا حکیم ہونا ضروری ہے اور ان کے کہنے کا مقصد یہ ہے کہ اگر کوئی کشف، برہان کے مخالف ہو تو اس کی تکذیب کی جا سکتی ہے۔

راقم عرض کرتا ہے کہ اس میں بعض اہلِ فن بزرگوں سے جو باتیں نقل کی ہیں اس کے علاوہ کشف و برہان سے متعلق دوسری باتیں بھی بہ فضلِ تعالےٰ بعض اعاظمِ قوم سے حاصل کی ہیں جن میں سے بعض کو اس منزل پر پیش کر رہا ہوں۔

شیخ کبیر سے لقب سے ملقب، محققِ عارف، صدرالدین

قونوی سورۂ حمد پر اپنی تفسیر "اعجاز البیان فی تاویل ام القرآن" میں ارشاد فرماتے ہیں:

«والمنقول عن أوائل الحكماء و ان كانوا من اهل الأفكار؛... أنهم انما كان دأبهم الخلوة والرّياضة؛ و الإشتغال على مقتضى قواعد شرائعهم التى كانوا عليها؛ فمتى فتح لهم بأمر ذكروا منه للتلاميذ والطلبة ما تقتضى المصلحة ذكره؛ لكن بلسان الخطابة لا التقرير البرهانى؛ فان لاحت عندهم مصلحة ترجح عندهم اقامة برهان على ما اتوابه و تأتى لهم ذلك ساعتئذ قرّروه و برهنوا عليه.»[1]

ترجمہ:

ابتدائی دور کے علما کے بارے میں جو بات نقل کی جاتی ہے وہ یہ ہے کہ یہ لوگ باوجود اس کے اہلِ برہان اور اہلِ فکر و نظر تھے انکی خلوت نشینی، ریاضت اور عبادت ان کے اپنے زمانے کے شریعتوں کے مطابق ہوتی تھی۔ (عبادت و ریاضت کے زیر اثر) جب کبھی کوئی بات ان پر منکشف ہوتی تھی وہ اسے اسی حد تک شاگردوں کے سامنے پیش کرتے تھے جس حد تک مصلحت کا تقاضا ہوتا تھا۔ لیکن یہ زبانِ خطابت نہ بہ انداز برہان۔ ہاں اگر اسی وقت اور اسی گھڑی (الہام یا دوسرے طریقے سے) کوئی مصلحت ان پر ظاہر ہوتی تو وہ اس مصلحت کی بنیاد

۱: مطبوعہ تحقیقی قاہرہ ص ۱۱۲۔

پر اس بات کو ترجیح دیتے تھے کہ اپنے مکشوف کو برہان سے ثابت کریں اور پھر وہ اُسے برہان کی بنیاد پر پیش کرتے تھے۔"

راقم الحروف عرض کرتا ہے:

قونوی، شہودی عرفان کے بڑے اونچے طرف داروں میں سے تھے لیکن آپ نے ملاحظہ فرمایا کہ انھوں نے بھی کشف و برہان کی مطابقت کو مکمل طور پر تسلیم کیا ہے۔

ایک نہایت باریک نکتہ

محترم قارئین، کتاب کا یہ حصّہ شاید بظاہر ایک جُملہ معترضہ ہو لیکن در حقیقت یہ پچھلی گفتگو کی تکمیل ہے، بہر حال جو بھی ہے ایک قابلِ ذکر نکتہ ہے (خذها وكن من الشاكرين) اور وہ یہ ہے۔

شیخ عارف صدر الدین قونوی کہتے ہیں:

«... هذا حال أهل الأذواق و مذهبهم حيث يقولون... و امّا المتحصّل لنا بطريق التّلقى من جانب الحقّ و إن لم يقم عليه البرهان النظرى فانّه لا يشكّكنا فيه مشكك و لا ريب عندنا فيه و لا تردّد.» [1]

۱: اعجاز البیان ص ۱۲۰

ترجمہ کا خلاصہ :

اہلِ ذوق کا کہنا ہے، کشف کی راہ جو چیز ہمیں حق عطا کرتی ہے اس میں کوئی شخص ہمیں شک میں مبتلا نہیں کر سکتا۔ اور ہم ریب و تردید میں نہیں پڑ سکتے واضح رہے کہ کشف سے اُبھرنے والی بات نہ برہان کی تائید کے ساتھ ہے یا نہیں ہے۔ جو کشف برہان کی تائید کے ساتھ ہے وہی صحیح اور مقبول ہے۔ عندالاکابر ہے۔

اور جو برہان کے ساتھ نہیں ہے اس کی بھی دو[2] صورتیں ہیں۔[1]

الف : وہ کشف جو کہ برہان کے برخلاف قائم ہے، وہ وہی قابلِ تکذیبِ کشف ہے کہ جس کے بارے میں ہم پہلے عرض کر چکے ہیں۔

ب : وہ کشف کہ جس کے خلاف کوئی برہان قائم نہیں ہے، لیکن اس کے اثبات اور صحت کے لئے بھی ہمارے پاس کوئی ثبوت نہیں ہے۔ اس کی بھی دو[2] قسمیں ہیں۔

۱: اسلئے کہ جس چیز کی برہان تائید نہ کرے ہو سکتا ہے کہ اسکے خلاف کوئی برہان قائم ہو اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اسکے اثبات کے لئے ہم کوئی دلیل نہ ڈھونڈ سکیں۔ یہ دونوں باتیں درحقیقت برہان کی تائید کے دائرہ میں نہیں ہیں لیکن اسمیں ایک فرق وہی ہے جسے ہم بیان کر چکے ہیں۔

۱ ——— وہ کشف جس سے ابھرنے والی بات کے بارے میں ہمارا ذہن (سلباً یا ایجاباً) پہلے سے مطلع ہو لیکن صاحب کشف ہماری اس اطلاع میں کوئی نئے آنے والے واقعہ کی خبر دے یا اس میں کوئی تبدیلی کرے ۔ اس منزل پر ہم ذہن میں پہلے سے موجود خبر کو اس کشف کے خلاف، برہان قائم قرار نہیں دے سکتے مگر یہ کہ جستجو یا کاوش کو کام میں لایا جائے، یا صاحب کشف کا تعلق اعاظم اور اولیاء سے ہو جیسے ہمیں معلوم ہے کہ زید نامی بچہ مادر زاد اندھا ہے، مگر صاحب کشف کہتا ہے کہ میں نے اپنے کشف میں یہ بات دیکھی کہ زید کی بینائی واپس آگئی ہے، یا کوئی اس بات کا انکشاف کرے کہ تمھاری فلاں الجھن فلاں وقت دور ہوگی ۔

۲ ——— وہ کشف اس کے بارے میں از قبل ہمیں خبر نہیں ہے اور اس کی ماہیت ہمارے لئے مکمل طور پر مجہول ہے ۔ اس صورت میں ہماری طرف سے تصدیق وتکذیب کے سلسلے میں کسی دلیل کا قیام کوئی مفہوم نہیں رکھتا ۔ پس ہم صاحب کشف کی بات کو امکانی حدود میں رکھ کر خاموشی اختیار کرتے ہیں مگر یہ کہ کشف کا دعویٰ

کرنے والی شخصیت کا سچ یا جھوٹ کسی اور طریقے سے جو عقل کے نزدیک قطعی اور حتمی ہو پائے ثبوت کو پہنچے اور یہ خود ایک طرح کی دلیل اور ایک طرح کا برہان ہے لیکن اس کا تعلق اس برہان سے نہیں کہ جو کشف سے متعلق ماہیت کے بارے میں ہمارے علم سے حاصل ہوتا ہے۔ فافہم۔

برہان سے کشف کی عدم مخالفت کے سلسلے میں صدر المتالھین کی گفتگو

«ایّاک و ان تظنّ بفطانتک البتراء أن مقاصد هؤلاء القوم من أکابر العرفاء و اصطلاحاتهم و کلماتهم المرموزة خالیة عن البرهان من قبیل المجازفات التخمینیّة أُوالتخیّلات الشعریّة حاشاهم عن ذلک؛ و عدم تطبیق کلامهم علی القوانین الصّحیحة البرهانیّة، والمقدمات الحقّة الحکمیّة ناش عن قصور الناظرین؛ و قلّة شعورهم بها و ضعف احاطتهم تبلک القوانین؛ و الّا فمرتبة مکاشفاتهم فوق مرتبة البراهین فی إفادة الیقین؛ بل البرهان هو سبیل المشاهدة فی الأشیاء الّتی یکون لها سبب؛ إذالسبب برهان علی ذی السبب، و قد تقرر عندهم انّ العلم الیقینی بذوات الأسباب لایحصل الا من جهة العلم بأسبابها، فاذا کان هذا هکذا فکیف یسوغ کون مقتضی البرهان

مخالفاً لموجب المشاهدة؟ و ما وقع فی کلام بعض منهم: «ان تکذّبهم بالبرهان فقد کذّبوک بالمشاهدة» معناه: ان تکذبهم بما سمیّت برهاناً؛ و الّا فالبرهان الحقیقی لا یخالف الشهود الکشفی.[1]»

ترجمہ:

خبردار ایسا نہ ہو کہ تم اپنی عقلِ ناقص سے یہ گمان کرو کہ اکابرین عرفاء کے مقاصد اور ان کے پُر اسرار الفاظ اور اصطلاحات برہان سے خالی ہیں یا اس میں شعری خیال آرائی اور تخمینی اُڑان ہے۔ یہ لوگ اس طرح کے تصور اور اس کی نسبت سے دور ہیں اور اگر ان کی بات صحیح برہانی قوانین اور حکمت کے بنیادی اصولوں پر بظاہر پوری نہیں اُترتی تو اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ پوری نہیں اُتر سکتی۔ بلکہ یہ ظاہری عدم مطابقت، ان قوانین کی نسبت قارئین کی ناکافی اطلاعات اور ان کے حدود کو سمجھنے میں تقصیر کے سبب ہے، وگرنہ افادۂ یقین میں حقیقی عرفا کے مکاشفات کا مرتبہ براہین سے بالا ہے بلکہ برہان ان مشاہدے کی راہ ہے کہ جن کا کوئی سبب ہوتا ہے۔ اس لئے کہ سبب، دلیل کے حصول کا ذریعہ ہے درآں حالیکہ عرفا کے نزدیک یہ بات طے شدہ ہے کہ علمِ یقین اسباب کے حامل افراد کی نسبت اسباب سے نہیں بلکہ صرف علم سے حاصل ہوتا ہے۔ اب جبکہ بات

۱: اسفار۔ پتھر کی چھپائی ص ۱۸۷۔

ایسی ہے تو پھر یہ کیونکہ جائز ہوگا کہ مقتضای برہان کشف سے حاصل ہونے والی بات سے مختلف ہو؟ اور بعض عرفاء نے کہا ہے کہ: "اگر تم ان کے برہان کو جھٹلاؤ گے تو وہ بھی تمہارے مشاہدہ کی تکذیب کی تکذیب کریں گے" یعنی اس چیز کی جس کا نام تم نے برہان رکھا ہے یا برہان کا نام دیا گیا ہے، حقیقی برہان سے اس کا واسطہ نہیں کیونکہ حقیقی برہان کشفی شہود کے ساتھ کوئی مخالفت نہیں رکھتا۔

مولانا روم کے کلام "پای استدلالیان چوبین بود" کی تفسیر میں حکیم سبزواری کی بات اور کشف و برہان کی مطابقت میں ان کی رائے آپ اگلے صفحات میں ملاحظہ فرمائیں گے۔ انشاء اللہ۔

ایک ممکنہ سوال

ممکن ہے کوئی یہ کہہ بیٹھے کہ آپ مولانا کے اس شعر کی جس میں آپ فرماتے ہیں "پای استدلالیان چوبین بود،"[1] ایک فلسفی یعنی حکیم سبزواری کی زبان سے توجیہ و تاویل کر رہے ہیں اور اس پر اس سے بڑے فلسفی یعنی ملا صدرا کی بات بھی نقل کر رہے ہیں، حالانکہ عرفاء

۱: مثنوی کے بعض شارحین نے (جیسے ساری عبداللہ آفندی کہ جنھوں نے "جواہر جواہر" جلد ۲ ص۱۱ میں) اس شعر کو صدیقین کے برہان کے مقابل برہان پر محمول کیا ہے۔ چونکہ یہ گفتگو اس خاص رخ پر نہیں ہے جس پر کہ ہم نے اسے استخراج کیا ہے اسلیئے ہم اس بحث میں داخل نہیں ہوتے۔

اور فلسفی ایک دوسرے کی ضد ہیں اور ظاہراً دو علیحدہ دائروں کے حامل ہیں اور اُن کے جھگڑوں کی مضبوط و محکم بنیادیں ہیں، اس صورت میں کیا دو فلسفیوں کے دو نظریات سے سارا جھگڑا ختم ہو جائے گا یا اس میں کوئی اور بات ہے جس سے آپ بے خبر ہیں؟ کیا آپ نے فلسفہ اور اس سے متعلق لوگوں کی نسبت مولانا کے مکرر طعنوں کو ملاحظہ نہیں کیا ہے جہاں وہ فرماتے ہیں: ؎

فلسفی راز ہرہ نی تا دم زند
دم زند دینِ حقش برہم زند

یا پھر کہتے ہیں:

فلسفی گوید ز معقولات دون
عقل از دہلیز می ماند برون
فلسفی منکر شود در فکر و ظن
گو برو سر را بر آن دیوار زن
فلسفی کو منکر حنانہ است
از حواس انبیاء بیگانہ است
فلسفی مر دیو را منکر شود
در ہمان دم سخرۂ دیوی بود

یا پھر یہ گفتگو کہ:

فلسفی خود را از اندیشہ بکشت

گو بدو کو را سوی گنج است پشت

گو بدو چندان کہ افزون میدود

از مراد دل جداتر می شود

جاہدوا فینا بگفت آن شہریار

جاہدوا عنا نگفت ای بیقرار

جواب

پہلی بات تو یہ ہے کہ عرفاء اور فلاسفہ کے درمیان اختلاف اور تقابل کا عنصر کلیت نہیں رکھتا۔ ہاں یہ بات درست ہے کہ بعض عرفا اور اہلِ فلسفہ جیسا کہ پہلے کہا گیا ایک دوسرے کے مقابل دو مختلف سمتوں کے حامل ہیں لیکن اسلام کے عظیم صاحبانِ فکر و نظر خواہ وہ عارف ہوں کہ فلسفی متکلم ہوں کہ فقیہ ایک دوسرے کے ساتھ بنیادی اختلافات نہیں رکھتے۔ وہ سب کے سب ایک ہی مقصد اور ایک ہی ہدف کے حامل ہیں اور وہ ہے کمال تک رسائی اور حضرت رب الارباب اور واہب العقول والالباب کے جمال کا مشاہدہ، عارفِ کامل فلسفہ کے صحیح براہین کا منکر نہیں ہے اور اسی طرح کامل و اکمل فلسفی، حقیقی عرفاء کو تعظیم کی نگاہوں سے دیکھتا ہے۔ کامل معتدل متکلم، کلام کو باطنی سلوک کی تمہید جانتا ہے اور یہی حال

فقیہ کامل کا بھی ہے۔

اس غزل پر میں یہ ضروری سمجھتا ہوں کہ حکیم اور محقق متکلم عبدالرزاق لاہیجی سے کہ جسے اپنے اُستاد اور سُسر جناب صدرالمتالھین شیرازی سے "فیاض" کالقب ملا، ایک قابلِ قدر بات نقل کرتا ہوں۔ حکیم لاھیجی اپنی کتاب "گوہر مُراد[1]" میں لکھتے ہیں:

"یہ بات واضح ہونی چاہیئے کہ دو راہوں سے انسان اللہ کی طرف جاتا ہے۔ ایک راہ ظاہری ہے اور دوسری باطنی، باطنی راہ وہ ہے کہ جس سے خدا تک پہنچا جاسکتا ہے۔ اور ظاہری وہ ہے کہ جس سے خدا کو جانا جاسکتا ہے اور جاننے سے پہنچنے تک کا راستہ بڑا طویل ہے جس راہ کی صعوبتوں کے بارے میں اشارہ کیا گیا ہے وہ باطن کی راہ ہے۔ ظاہر کی راہ اتنی زیادہ صعوبت بھری نہیں کیونکہ یہ استدلال کی راہ ہے اور استدلال ہر عاقل کے بس کی بات ہے اور اس میں آثار سے موثر تک پہنچا جاتا ہے استدلال کی راہ کو سلوک کی راہ پر تقدم حاصل ہے اس لئے کہ جب تک کوئی یہ نہیں جانتا کہ کہیں کوئی منزل ہے اس وقت تک اس راستے کی طلب نہیں ہوسکتی جو منزل کی سمت جاتی ہو۔ انبیاء کی بعثت استدلال اور ظاہری راستے کی ہدایت کے لئے نہیں ہے بہ ایں معنا کہ اس راہ کا حصول پیغمبرؐ کی شناخت پر موقوف ہے اور اگر ایسا ہے تو پھر ایک مسلسل دور لازم

۱: چاپ سنگی ۱۲۷۷ھ

آئے گا اس لئے کہ پیغمبرؑ کے سلسلے میں اس بات کی تصدیق کہ وہ خدا کے فرستادہ ہیں، خدا کی شناخت پر موقوف ہوگا۔ حالانکہ اس راہ کی ہدایت کے سلسلے میں پیغمبرؑ کا عمل سوتوں کو جگانا ہے، جو کوئی صحیح البصر سوتے کو بیدار کرتا ہے وہ لامحالہ خود اپنی حدِ توانائی میں اشیاء کو دیکھتا ہے اور وہ جگانے والا جاگنے والے کی بصارت میں جگانے سے زیادہ کوئی دخالت نہیں رکھتا اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ کوئی خود بخود جاگ پڑے اور اشیاء اس کی نظروں میں جلوہ افروز ہوں، پس جاگنا دوسروں کے جگانے ہی پر موقوف نہیں۔

اسی طرح، لوگ خوابِ غفلت میں ہیں اور چشمِ عقل سے غفلت کی نسبت، ایسی ہی ہے جیسے چشمِ احساس سے خواب کی ہوا کرتی ہے۔ پس پیغمبروں کا کام اس راہ میں یہ ہے کہ وہ سب کو غفلت کی نیند سے بیدار کریں، تاہم کوئی خود سے بھی بیدار ہو سکتا ہے۔

پس جب لوگ خوابِ غفلت سے بیدار ہوں گے اور اس عقل سے کام لیں گے جو پردۂ غفلت کی نیند سے بیدار کریں، تاہم کوئی خود سے بھی بیدار ہو سکتا ہے۔

پس جب لوگ خوابِ غفلت سے بیدار ہوں گے اور اس عقل سے کام لیں گے جو پردۂ غفلت سے باہر نکل چکی ہوگی تو خدا یقین کے ساتھ ان کی عقل میں سما جائے گا اور اگر خوابِ غفلت سے جاگنے کے بعد

خدا اُن کی عقل میں نہیں سمایا تو اس کا سبب عقل کو بروئے کار نہ لانا ہوگا اور اس کی مثال ایسی ہوگی جیسے کوئی نیند سے اُٹھے اور اشیاء کو دیکھنے کے لئے اپنی آنکھیں نہ کھولے اور اسی لئے جو لوگ انبیاء کی بعثت اور ان کے ذریعے اپنی بیداری کے بعد ایمان نہیں لائے خداوندِ عالم انہیں اپنی آسمانی کتاب قرآنِ مجید میں اہلِ جحود و عناد سے یاد کرتا ہے، کیونکہ جحود وہ ہوتا ہے کہ جو جانتا ہو اور کہتا ہو کہ نہیں جانتا، اور وہ بیدار جو اشیاء کو دیکھنے کے لئے اپنی آنکھیں نہ کھولے اور کہے کہ: کچھ نہیں ہے وہ لامحالہ معاند ہے۔ لہٰذا ایسے لوگوں کے لئے قرآنِ مجید کئی مقامات پر بر سبیل تعجب فرماتا ہے: "افلا تبصرون"، "افلا تعلقون"، "افلا تبدبرون" وغیرہ، پس اگر انسانی عقل راہ ظاہر کے سلوک اور آثار سے موثر کے استدلال پر قائم نہیں رہتی تو جائے صد تعجب ہے۔

واضح ہونا چاہیئے کہ راہِ ظاہر اور راہِ باطن کے سلوک میں یکسانیت نہیں ہے بلکہ وہ ایک دوسرے کے برعکس ہیں اس لئے کہ راہ استدلال کا سالک اشیاء کے اثبات کو درجہ بہ درجہ آگے بڑھاتا ہے اور اسے اس سببی اثبات تک لے آتا ہے کہ جس کے آگے اور کوئی سبب نہیں ہوتا، مثلاً وہ اثر کے مشاہدہ سے اثبات کرتا ہے کہ اس کا کوئی موثر ہوگا اور جب وہ اس موثر میں معلولیت کے آثار کو دیکھتا ہے تو کہتا ہے اس کا بھی کوئی دوسرا موثر ہوگا اور اسی طرح یہ سلسلہ اس موثر اثبات پر

جاکر ختم ہوتا ہے کہ جس میں معلولیت کا کوئی اثر نہیں ہوتا۔

راہِ باطن کا سالک اشیاء کو مرتبہ بہ مرتبہ نفی کرتا ہے یہاں تک کہ اس موجود تک پہنچتا ہے جس کے فنا کی راہ مسدود ہوتی ہے مثلاً سالک جب دلیل سے یہ جان لیتا ہے کہ علت اور خالقِ اشیاء کے لئے یہ ضروری ہوتا ہے کہ اس میں کوئی نقص، کوئی حاجت اور مکمل طور پر کوئی آثار معلولیت نہ ہو تو اب نقص اور حاجت سے متعلق جو چیز بھی وہ اس میں دیکھتا ہے اس کی نفی کرتا ہے یہاں تک کہ اس کامل تک پہنچتا ہے جس میں کوئی نقص نہیں ہوتا اور اس کے بعد وہ اس سے اپنی نظریں نہیں پھیر سکتا اور فطری طور پر ہر اس چیز کا دشمن ہو جاتا ہے جو اس کامل کے ملاحظہ سے باز رکھتا ہے۔ اور اس کی نفی کے لئے کمربستہ ہو جاتا ہے اور ہمیشہ لذّتِ مشاہدہ میں مستغرق رہتا ہے اور یہ لذّت اس پر اس طرح سایہ فگن رہتی ہے کہ اسے اپنی بھی خبر بھی نہیں ہوتی دوسروں کی بات تو دُور کی چیز ہے۔ یہی وہ لذّت ہے جسے حکمِ الٰہی حقیقی سعادت کا نام دیتے ہیں اور صوفی محققینِ اسے وصول وفنا سے متعارف کرتے ہیں اور یہی قرۃ عین انبیاء واولیا ہے، انبیاء والمرسلین کے بعثت کی غرض و غایت ہی یہی ہے کہ وہ لوگوں کو اس لذّت کی طرف دعوت دیں۔ اور اس مرتبۂ عظمیٰ کی طرف رہنمائی کریں، کیوں کہ کسی کی عقل راہِ سلوک میں مستقل نہیں ہو سکتی۔

حکیم لاہیجی کی ایک اور قابلِ غور گفتگو

"لاہیجی اسی کتاب کی تمہید میں لکھتے ہیں، واضح رہے معارفِ الٰہی میں جس چیز پر علماء کا اختلاف ہے اس کا تعلق متکلمیت اور حکمیت سے ہے اور متکلمیت کا اختلاف معتزلیت اور اشعریت میں ہے۔ لیکن طریقہ تصوف ان اقسام کی تقسیم کار نہیں اس لئے کہ ان اقسام کا اختلاف راہِ ظاہر کے سلوک اور نظر و استدلال کے طریقے میں ہے، حقیقتِ تصوف، سلوکِ راہ باطن کے سوا کچھ نہیں۔ ان کی غرض، حصولِ علم اور ان کی غایت وصولِ عین ہے۔ اور یہ بات واضح ہو چکی ہے کہ سلوکِ باطن کی راہ سلوک ظاہر پر استوار ہے۔ پس صوفی ابتدائی منزل میں یا حکیم ہوگا یا متکلم اور علمِ حکمت و کمال کے استحکام اور طریقۂ نظر کے استکمال کے بغیر خواہ وہ علماء کی فکر و نظر کے موافق ہو یا مخالف تصوف کا دعویٰ صیادی اور عوام فریبی ہے یہاں گفتگو تصوف کے لفظ یا صوفی کی لغت سے نہیں ہے پچھلے صفحوں پر ہم عرض کر چکے ہیں کہ خدا کا بندہ اپنے لئے اسم و عنوان نہیں رکھتا۔ عرفان تشخص اور اسم و رسم سے چھٹکارے کا نام ہے ان میں قید یا اسیر ہونا نہیں ہے۔ بلکہ ہماری غرض معنوی سلوک اور حقیقی طلب وصول سے ہے اور ہر اس چیز کے فانی ہونے کی بات ہے جو اس کا غیر ہے اور اس بقاء کی گفتگو ہے جو اس سے ہے، "کنت سمعہ وبصرہ" کی

حدیث اسی مرتبہ کی طرف اشارہ ہے۔"

ثانیاً ہم اپنے گزشتہ مباحث میں اس بات کو واضح کر چکے ہیں کہ ہم نے "عرفاء اور فلسفی لوگوں کے درمیان پائے جانے والے اختلاف سے صرفِ نظر کرتے ہوئے" مولانا کے شعر کی تفسیر کی ہے اور آپ نے ملاحظہ فرمایا کہ اس شعر کا مفہوم حدِّ اعتدال میں تمام بزرگوں کے لئے چاہے وہ عارف ہوں یا فلسفی قابلِ قبول ہے۔

ثالثاً ان فلسفیوں سے کہ جنھیں مولانا نے طعنے کی زد پر رکھا ہے ان کی مراد وہ لوگ ہیں جو ایک ایسے خشک فلسفے کی پیروی کرتے ہیں جسے اسلام کے صاف و شفاف چشمے سے اپنی پیاس نہیں بجھائی یا بجھائی بھی ہے تو بہت کم۔ بلکہ کبھی کبھی ان کی مراد وہ ملحد اور بے دین لوگ بھی ہیں کہ جو گاہے فلسفی کے عنوان سے سماج اور معاشروں میں ظاہر ہوتے ہیں۔ اور یہ بات صاف طور پر ان کے کلام سے جھلکتی ہے اور وہ بہ اصطلاح معروف سب کو ایک لاٹھی سے نہیں ہانکتے، ذیل کے اشعار اسی مفہوم کے آئینہ دار ہیں۔ اور اس بات کی تائید کرتے ہیں:

فلسفی از نوع دیگر کردہ شرح

باحثی مر گفت او را کردہ جرح

وان دگر در ہر دو طعنہ می زند

وان دگر از زرق جانی میکند

ہر یکی زین رہ نشانہا زان دہند
تا گمان آید کہ ایشان ران دہند

این حقیقت دان نہ حقند این ہمہ
نی بکلی گمرہانند این رمہ

حق شبِ قدر است در شبہا نہاں
تا کند جان ہر شبی را امتحان

نی ہمہ شبہا بود قدر ای جوان
نی ہمہ شبہا بود خالی از آن

در میان دلق پوشان ای فقیر
امتحان کن وانکہ حق است آن بگیر

آنکہ گوید جملہ حقّست احمقیست
وانکہ گوید جملہ باطل او شقیست

رابعاً: آپ مُلّا صدرا جیسی ہستی کو ملاحظہ فرمائیں کہ جن کا شمار اسلام کے عظیم ترین فلسفیوں میں ہوتا ہے بلکہ فلسفی ہونے کے علاوہ عرفان میں بھی ان کا ایک بلند مقام ہے اور بڑے اونچے درجہ کے عرفاء کی فہرست میں ان کا نام آتا ہے اور عرفان کے دقیق ترین مسائل میں بھی ان کا احاطہ بے مثل و بے نظیر ہے اگر عرفان اور فلسفہ کے درمیان مخالفت کی بات کلّیت رکھتی تو صدرا جیسی شخصیتیں یقیناً اتنا قص سے

سے دوچار ہوتیں۔ جیسا کہ ہم پہلے کہہ چکے ہیں بڑی شخصیتوں کے درمیان کوئی بنیادی اختلاف موجود نہیں ہے، دیکھنا یہ ہوتا ہے کہ وہ کون فلسفی ہے جو عارف سے الجھتا ہے اور وہ کون عارف ہے جو فلسفی سے برسرِپیکار ہوتا ہے اور اس پر طعن و تشنیع کرتا ہے۔ اگر مولانا، صدرا کے دور میں ہوتے تو یقیناً صدرالحکماء کی طرف اپنا ہاتھ بڑھاتے اور ان جیسی ہستیوں پر طنز کے تیر نہیں چلاتے۔

صدرا ایک عظیم فلسفی ہونے کے باوجود، خشک اور بے جان فلسفہ کے مطالعہ سے بیزار تھے اور اہلِ بیتؑ وحی و عصمت صلوات اللہ علیہم کے بنیادی فلسفہ سے علیحدگی کو خارج از امکان جانتے تھے اور ریاضت اور مجاہدت کی راہ سے نور کے حصول کی نسبت بے توجہی کے شدید مخالف تھے۔ صدرالحکماء "اسفار" (پتھر کی چھپائی صفحہ ۴) کے مقدمہ میں کہتے ہیں "میں نے بعض اوقات ان صحیح مطالب کے تذکرہ پر اکتفاء نہیں کیا جن پر خود میرا عقیدہ و اعتماد تھا بلکہ اس سلسلے میں، میں نے اہلِ فلسفہ کے طرائق و مطالب پر نظر ڈالی کہ وہ اس ضمن میں کیا کہتے ہیں"۔

وہ کہتے ہیں:

یہ کام میں صرف اس لئے کرتا تھا کہ بعض نامانوس تصورات اور پیارے انداز کے عظیم تصرفات پر مشتمل بعض مباحث مشکل مسائل کے استخراج کا ملکہ طالب علموں کے اذہان میں پیدا کرتے تھے اور انھیں

دشوار مسائل کو سمجھنے میں مدد دیتے تھے۔ یہ بزرگ و بالا حکیم مزید ارشاد فرماتے ہیں: میں نے تنقید و تفسیر کے ضمن میں ان مسائل کے کمزور نقاط کی نسبت اطلاعات فراہم کی ہیں۔

صدر المتالہین کا عقیدہ ہے کہ بعض فلسفیانہ مطالب موضوعیت نہیں رکھتے بلکہ طریقیت رکھتے ہیں اور ان کا بڑا فائدہ یہ ہے کہ وہ دانشمندوں اور صاحبِ نظر لوگوں کے افکار کا احاطہ کرتے ہیں اور یہ آگاہی اور احاطہ وصول کی نسبت حصولِ شوق کا مقدمہ ہے، قطعی بات یہ نہیں ہے کہ عقلی یا نقلی مباحث کے نقوش الواح نفوس میں گھر کر جائیں اس لئے کہ یہ فقط اکیلے اپنی ذات میں سکونِ قلب کا باعث نہیں ہوتے بلکہ یہ سب راہِ معرفت کے سلوک کی تمہید ہیں وہ بھی اس صورت میں جب طالبِ علم ابرار کی راہ کا مقتدی اور اخیار کے صفات کا مظہر ہو:

«واعلم انی ربما تجاوزت عن الإقتصار علی ما هوالحق عندی واعتمد علیه اعتقادی الی ذکر طرائق القوم و مایتوجّه الیها و مایرد علیها؛ ثمّ نبّهت علیه فی اثناء النقد والتزییف؛ والهدم والترصیف والذّبّ عنها بقدر الوسع و الإمکان؛ و ذلک لتشحیذ الخواطر بها؛ و تقویة الأذهان من حیث اشتمالها علی تصورات غریبة لطیفة؛ و تصرّفات ملیحة شریفة؛ تعدّ نفوس الطالبین للحق ملکة لاستخراج المسائل المعضلة؛ و تفید اذهان المشتغلین بالبحث اطلاعاً علی المباحث المشکلة؛ والحق ان اکثر المباحث المثبتة فی الدفاتر؛

المكتوبة فی بطون الأوراق؛ انّما الفائدة فيه مجرّد الإنتباه والإحاطة بافكار اولی الدراية والأنظار؛ لحصول الشّوق الی الوصول؛ لا الاكتفاء بانتقاش النفوس بنقوش المعقول اوالمنقول؛ فان مجرّد ذلک مما لايحصل به اطمينان القلب؛ و سكون النفس؛ و راحة البال، و طيب المذاق، بل هی ممّا يعدّ الطالب لسلوک سبيل المعرفة والوصول الی الأسرار؛ ان كان مقتدياً بطريق الأبرار؛ متّصفاً بصفات الأخيار.»

یہ بلند پایہ حکیم ظاہری عرفاء کی بلند پروازیوں سے یا ان کی اپنی تعبیر میں عام قسم کے صوفیا کی لغوباتوں یا ان کی واہیات، سے بیزار ہے اور مذہب کی قید سے آزاد بہروپی فلسفیوں کی لفاظیوں اور ان کے اقاویل کو بڑی شدّت سے اپنی تنقید کا نشانہ بناتا ہے۔ انھوں نے کتاب کے کسی صفحہ پر لکھا ہے۔

«و انّی لأستغفرالله كثيراً ممّا ضيّعت شطراً من عمری فی تتبّع آراء المتفلسفة والمجادلين من اهل الكلام؛ و تدقيقاتهم و تعلّم جربزتهم فی القول؛ و تفنّنهم فی البحث، حتی تبيّن لی آخر الأمر بنور الإيمان؛ و تأييد الله المنّان؛ انّ قياسهم عقيم؛ وصراطهم غيرمستقيم، فألقينا زمام امرنا اليه و الی رسوله النّذير المنذر؛ فكلّ ما بلغنا منه؛ آمنّا به و صدّقناه؛ و لم نحتل ان نخيّل له وجهاً عقليّاً و مسلكاً بحثيّاً؛ بل اقتدينا بهديه، و انتهينا بنهيه؛ امتثالاً لقوله تعالی: «ما آتاكم الرسول فخذوه و ما نهيكم عنه فانتهوا» حتّی فتح الله علی

قلبنا ما فتح؛ فافلح ببركة متابعته و انجح.»

اس کے بعد کی سطروں میں فرماتے ہیں:

«و لا تشتغل بترهات عوامّ الصوفيّة من الجهلة؛ و لا تركن الى أقاويل المتفلسفة(٥) جملة" واضح رہے کہ یہ باتیں بھی فلسفی اور عارف افراد کی درگت کے مفہوم میں نہیں ہیں۔ صدرالمتالھین جیسے عظیم فلسفی اور عارف کی یہ بات اسلامی فلسفے میں ان کی مہارت اور الہٰی معارف میں ان کی حرّیت، آزادگی اور بلند نظری کو ظاہر کرتی ہے۔ اس منزل پر ان کا روئے سخن عام افراد یا معارفِ الہٰی سے نابلد غیر عامی لوگوں سے نہیں بلکہ ان لوگوں سے ہے جو صاحبِ نظر ہیں۔

صدرا کہتے ہیں: لاغر اور جسیم کے فرق کو پہچانو، پانی کو سراب اور چھلکے کو مغز سے الگ کرو۔ ہر فلسفہ کہی جانے والی چیز فلسفہ نہیں ہوتی۔

---

(٥) دکتر احسان الله استخری در کتاب اصول تصوف (ط تهران ١٣٣٨هـ ش) ص ٣٠۔ از فصل الخطاب سید قطب الدین محمد نیریزی نقل می کند که گفته: «... و منهم العالم العامل والفاضل العارف الكامل المولى صدرالدين محمد الشيرازى فى تفسير القرآن و شرحه لكتاب اصول الكافى و كتاب اسفاره و كتاب شواهد الربوبيّة و كتاب الحكمة العرشيّة و كتاب اسرار الآيات و بعض منظوماته؛ و لقد كان استاد استاد استادى، و كثير من تصانيفه لدىّ و بعضها بخطه الشريف؛ و لكنه لما كان فى عصره الفيلسوفيون غالبين، لم يرو لم يدر بدأ الآبان يتكلم بالسنتهم، و لقد بين المعارف الإلهيّة التى للفقراء الإلهيين على طريقة منطق الفلاسفة و السنة المتكلمين، و لا مشاحة فى الاصطلاح.»

معارفِ الہٰی، لفاظی اور بلند پروازی سے الگ شے ہے۔

صدرا کا عقیدہ ہے کہ معارفِ الٰہی اور سعادتِ عظمیٰ قرآن، رسولِ اکرم صلّی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور ان کے اہلِ بیت علیہم السّلام کے تعالیم کی راہ کے علاوہ کہ جو حججِ الٰہی، معادنِ رحمت اور محالِ برکات حضرتِ حق ہیں، اور کہیں نہیں ملتا (شرحِ اصولِ کافی کے مقدّمہ سے رجوع فرمایئے)

پس معلوم ہوا کہ یہ ہستیاں برہان، استدلال، مدرسہ اور کتاب کی مخالف نہیں ہیں۔ اگرچہ ان کا ظاہری کلام بعض اوقات اس مفہوم کے شبہ کو ظاہر کرے، مختصر یہ کہ ان کے جانِ کلام اور مدعائے تمام کو کئی حصّوں میں خلاصہ کیا جا سکتا ہے۔

۱ـــــــ اعلیٰ درجہ کے الہٰی معارف اور دوراز فہم اسرار ربوبیت کو خدشات بھرے کمزور استدلالوں، بیجا قیاس آرائیوں اور مغالطات سے سمجھا نہیں جا سکتا۔ حکیم سبزواری "پای استدلالیاں چوبین بود" کی شرح میں لکھتے ہیں: "پای استدلالیان" سے مراد وہ لوگ ہیں جو واھی جدلیہ دلائل اور مغالطہ میں ڈالنے والے قیاسات کو عقیدہ میں شامل کرتے ہیں، حقیقت امر میں ڈانواں ڈول رہتے ہیں اور تقویٰ اور تعلیم حق سے دوری اختیار کئے ہوئے ہیں جبکہ حکم یہ ہے: "اتقوا اللّٰہ ویعلمکم اللّٰہ"[۱] اور نیز یہ بھی ہے کہ: "ان تتقوا اللّٰہ یجعل لکم فرقانا"[۲] ولیکن

۱: بقرہ: ۲۸۲ ـ ۲: انفال: ۲۹ ـ

اللہ کے نور سے منور عقول کے ادلہ و براہان، نعم الدلیل اور نعم القائد ہیں، قال اللہ تعالیٰ: "قل ھاتوا برھانکم ان کنتم صادقین" [1] اور یہ بھی کہ: "ادع الی سبیل ربک بالحکمۃ" [2] حقیقی براہین حضرت برہانِ دیّان کا نور ہیں۔

۲ —— قرآنِ مجید کے اسرار و دقائق، معصومین علیہم السّلام کے ارشادات اور دنیا کی بڑی شخصیتوں کے اسرار و مقامات ہیں متعلق مسائل، صرف و نحو، لغت و منطق اور فلسفے سے سمجھے نہیں جاتے اور اس منزل میں بات یہاں تک پہنچتی ہے کہ عقل کی کمیت کمزور پڑ جاتی ہے۔ جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے۔ «و اذا قرأت القرآن جعلنا بینک و بین الذین لا یؤمنون بالاخرة حجاباً مستوراً» [3] یہ بات قرآن کے فہم اسرار کے بارے میں ہے، لیکن اہلِ بیت علیہم السّلام کے بارے میں حضرتِ شاہِ ولایت صلوات اللہ علیہ ارشاد فرماتے ہیں: [4]

«لا یستکمل احد الإیمان حتی یعرفنی کنه معرفتی بالنورانیة»

پس محرم ہونا ضروری ہے، اور محرمیت صرف تقویٰ اور طہارتِ باطن سے حاصل ہوتا ہے۔

یہ بات بھی واضح رہے کہ حجاب اور محرمیت اور اسی طرح اہلیت

۱: بقرہ: ۱۱۱ ۲: نحل: ۱۲۵ ۳: اسراء: ۴۵

۴: بحار الانوار ۲۶/۱

اور محرومیت کے مراتب ہیں اور یہ مراتب ان کے اسباب وعوامل کی نسبت سے ہیں۔ (غور کیجئے)

۳ ـــــ مدرسہ، درس اور کتاب ذاتی مطلوبیت کے حامل نہیں ہیں، علماء کی اصطلاح میں درس اور کتاب طریقیت رکھتے ہیں، موضوعیت نہیں، درس اور کتاب، علم کے حصول کی تمہید ہیں۔ علم اپنے تحت اللفظی مفہوم میں بھی کہ جو جاننے سے عبارت ہے عرفاء اور محققین کے نزدیک ذاتی مطلوبیت نہیں رکھتا۔ علم، عمل تک پہنچنے کی تمہید اور اس کا راستہ ہے۔ عمل کا ایک نور دل میں اُترتا ہے اور علم، اس فن کے اکابرین کی اصطلاح اور عرفیت میں اسی نور سے اطلاق پاتا ہے۔ "العلم نور" اور علم اس مفہوم میں ذاتی مطلوبیت کا حامل ہے۔

۴ ـــــ اگر کوئی عالم اپنے علم پر عمل کرے تو علم اسے بال و پر دیتا ہے اور اگر عمل نہ کرے تو دانش اس کے لئے ایک بھاری بوجھ بن جاتا ہے۔ اور کیا خوب کہا ہے "مولوی" نے: ؎

علمہای اہلِ دل حمالشان
علمہای اہلِ تن احمالشان
علم چون بر دل زند یاری شود
علم چون بر تن زند باری شود

لیک چون این بار را نیکو کشی
بار بر گیرند و بخشندت خوشی

۵ ـــــ علم اگر عمل پر منتج نہ ہو تو اس کا نام دُنیا میں قیل وقال اور آخرت میں وزر[۱] وبال ہے۔

اس سلسلے میں بعض آیتوں اور بعض روایتوں پر توجّہ فرمائیں

خداوند تبارک وتعالےٰ قرآنِ مجید کی ہدایت کے بارے میں فرماتا ہے: "ھدی للمتقین"، قرآن ہدایت ہے متقیوں کے لئے ممکن ہے کوئی یہ کہے کہ یہاں ایک تسلسل یا دور کی ضرورت پیش آتی ہے اس معنا میں کہ: اگر کوئی قرآن سے ہدایت پانا چاہتا ہے تو اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ متقی ہو اور اگر کوئی متقی بننا چاہے تو اس کے لئے لازم ہے کہ قرآنِ مجید کی ہدایت سے استفادہ کرے۔

اب جو دو نکتے میں پیش کروں گا اس سے اس تسلسل دور کی ضرورت ختم ہو جائے گی اور اس کا حصار ٹوٹ جائے گا۔

الف: تقویٰ کے مراتب ہیں، تقوے کا سب سے کم مرتبہ یہ ہے کہ کم سے کم کوئی اپنے آپ کو قرآن کے استماع کے لئے آمادہ

۱:۔ "وزر" قرآن کا لفظ ہے جس کے معنیٰ بھاری بوجھ کے ہیں اور اسکی جمع اوزار ہے۔

کرے۔ استماع میں دلچسپی اپنے بعد اپنا ایک اثر رکھتی ہے، مراتبِ تقویٰ میں بلندی ذات کا بھی ایک مرتبہ ہے۔ عصرِ نزولِ قرآن میں، زمانۂ جاہلیت کے لوگوں کے درمیان کچھ افراد ایسے بھی تھے جن میں ذات کی بلندی پائی جاتی تھی اور یہی وہ لوگ تھے جو کہتے تھے: اب جب یہ شخص (یعنی جنابِ رسالتمآبؐ) کہتا ہے کہ مجھ پر وحی نازل ہوتی ہے تو اس میں ہرج ہی کیا ہے کہ ہم کچھ اس کی بات بھی سُن لیں۔ لوگ سُنتے تھے اور اُن میں انقلاب رونما ہوتا تھا۔ آمادگی اس حد میں بھی ہو تو یہ بھی تقویٰ کے مرتبہ میں آتی ہے اور تاریخ اس بات کی گواہی ہے کہ یہی آمادگی بہت سے لوگوں کی ہدایت کا سرچشمہ بنی ہے۔ ایسا شخص فلاں بدذات شخص سے بہتر ہے کہ جو تقویٰ کے کمترین درجہ میں بھی نہیں آتا اور جب اس کے سامنے قرآن کی تلاوت ہوتی ہے تو نہ صرف یہ کہ خود نہیں سُنتا بلکہ دوسروں کو بھی غل غپاڑہ پر اُبھارتا ہے تاکہ قرآن کی آواز اس شور میں دب جائے۔ "لا تسمعوا لھذا القرآن والغوا فیہ"[1] یقیناً ایسا شخص ہدایت نہیں پاسکتا۔

ب: "ھدی" سے مُراد قرآن کی مخصوص ہدایت ہے کہ جو اس کے دقائق، اسرار اور لطائف پر مبنی ہے۔ اس سلسلے میں ائمہ معصومین علیہم السلام سے بہت زیادہ روایتیں وارد ہیں، ہم اختصار کے پیشِ نظر

۱: فصلت: ۲۶۔

ان میں سے صرف ایک روایت پر اکتفا کرتے ہیں:

قرآنِ ناطق امیر المومنین صلوات اللہ علیہ ارشاد فرماتے ہیں:

«إنّ الله جلّ ذكره- لسعة رحمته و رأفته بخلقه... قسم كلامه ثلاثة اقسام: فجعل قسماً منه يعرفه العالم والجاهل؛ و قسماً لا يعرفه الّا من صفا ذهنه و لطف حسّه و صحّ تمييزه ممّن شرح الله صدره للإسلام؛ و قسماً لا يعرفه الّا الله و انبياؤه والرّاسخون فی العلم.»[1]

ترجمہ:

خداوندِ عالم نے اس رحمتِ واسعہ اور اس رأفت کے سبب جو اسے اپنے مخلوقات سے ہے اپنے کلام کو تین اقسام میں تقسیم فرمایا ہے:

۱:- ایک قسم وہ ہے جسے عالم و جاہل ہر کوئی سمجھ سکتا ہے۔ دوسری قسم ان لوگوں کے لئے ہے کہ جو صفائی ذہن، لطافت، باریکیِ حس اور صحتِ تشخص کے حامل ہیں اور یہ وہ لوگ ہیں کہ جنھیں خداوندِ عالم نے شرحِ صدر سے نوازا ہے اور اسلام کی روح اور اس کے راز کو ان کے سینوں میں جاگزیں کیا ہے، تیسری قسم کو خداوندِ عالم، اس کے رسول، اور راسخون فی العلم کے سوا کہ جو ائمہ معصومین علیہم السّلام

۱: تفسیر نور الثقلین: ۱/۳۱۳

ہیں اور کوئی سمجھ نہیں سکتا۔

۲۔ "ومن یؤمن باللہ یھد قلبہ"[1] جو کوئی اللہ پر ایمان لاتا ہے خدا اس کے قلب (یعنی اس کے باطن) کو ہدایت کرتا ہے، اگر ہم اس آیت کے مضمون پر غور کریں تو مقصد ہمارے ہاتھ آجائے گا۔

وہ آیات کہ جن سے ہدایتِ خاصّہ کی بات سامنے آتی ہے قرآنِ مجید میں بہ کثرت موجود ہیں، لیکن ہم نے صرف ان ہی دو آیتوں پر اکتفاء کیا ہے۔

لیکن احادیث

۱: امیرالمومنین۔صلوات اللہ علیہ۔نے فرمایا: «ایھا الناس اذا علمتم فاعملوا بما علمتم لعلکم تھتدون»[2]

ترجمہ:

"اے لوگو! جب علم و دانش حاصل کرو تو اس پر عمل بھی کرو شاید اس طرح تمھاری ہدایت ہو جائے۔"

میرے عزیز دوستو! اس نورانی کلام میں فکر کرو۔

۱: تغابن: ۱۱ ۲: اصولِ کافی جلد ۱ ص ۴۵

دھقان سالخوردہ چہ خوش گفت باپسر
کای نورِ چشمِ من بجز از کشتہ ندروی

۲۔ حضرت صادق۔ صلوات اللہ علیہ کا ارشاد ہے:

«لا یقبل اللہ عملا الّا بمعرفۃ و لا معرفۃ الّا بعمل»[1]

خدا کسی عمل کو قبول نہیں کرتا مگر یہ کہ وہ معرفت کی بنیاد پر ہو اور معرفت کا حصول اس وقت تک نہیں ہوتا جب تک عمل کی منزل نہ آئے۔

اس منزل پر بھی تسلسل لازم نہیں آتا، شاید پہلی معرفت سے مُراد صحت پر مبنی اعتقادات اور حق پر مبنی عقائد ہوں کہ جو انبیا اور ائمہ علیہم السّلام کے ذریعے ہم تک پہنچے ہیں اور ہر کوئی اپنی فکری توانائی کے مطابق اس کے حصول کا ذمہ دار ہے اور دوسری معرفت سے مُراد اس کے درجاتِ عالیہ ہوں کہ جو ریاضت، مجاہدت اور عمل کے ذریعے حاصل ہوتے ہیں۔

۳: آپ ہی سے یہ روایت بھی نقل ہے کہ آپؑ نے فرمایا:

«لیس العلم بالتّعلّم؛ إنّما ھو نور یقع فی قلب من یرید اللہ۔ تبارک و تعالی۔ أن یھدیہ؛ فإن اردت العلم فاطلب اوّلاً فی نفسک حقیقۃ

۱: اصولِ کافی جلد ۱ ص ۴۴

العبودية، واطلب العلم باستعماله، واستفهم الله يفهمك"[1]

ترجمہ:

(حقیقی) علم تعلم اور سیکھنے سے حاصل نہیں ہوتا، اور بجز اس کے کچھ نہیں کہ وہ ایک نور ہے اور اس دل میں اُترتا ہے جس کی ہدایت، خداوند تبارک وتعالیٰ کو مقصود ہو، پس جب تم علم حاصل کرنا چاہو تو پہلے اپنے اندر حقیقتِ بندگی کو طلب کرو، اور علم کو اس لئے سیکھو کہ اس سے کام لو اور اللہ سے سمجھ کی دُعا کرو تاکہ وہ (حقائق کو) تم پر ظاہر کرے۔

تیسری حدیث کی توضیح پر توجّہ فرمائیں

"فاطلب اوّلاً فی نفسک حقیقۃ العبودیۃ" کی تفسیر میں تین صورتوں کے تصوّر کو امکان میں لایا جاسکتا ہے۔

الف: ممکن ہے جُملہ کا مفہوم یہ ہو: علم کی فکر سے پہلے بندگی کی فکر میں رہو۔

ب: جس حد تک بندگی کے فرائض کا علم رکھتے ہو اس حد تک اپنی کوششیں بروئے کار لاؤ اور خدا کے بندے بنو۔

---

[1]: بحارالانوار ا ص ۲۲۵۔

ج : عبودیت کی حقیقت کو اپنے اندر تلاش کرو۔ یہ مفہوم بہت غور طلب، لطیف اور حضرت امیرالمومنین صلوات اللہ علیہ سے منسوب شعر کی طرف توجہ دلاتا ہے جس میں آپؑ فرماتے ہیں۔

دواؤک فیک وما تشعر
وداؤک منک وما تبصر

بنی نوع انسان فطرتاً کمال کا دلدادہ ہے اور اسے محبوب کی جستجو رہتی ہے۔ عبودیت کا خمیر انسان کے وجود میں مخفی و مستور ہے، پہلے میں اشارتاً عرض کر چکا ہوں کہ حضرت سیّد الساجدین صلوات اللہ علیہ صحیفہ کی پہلی دُعا میں ارشاد فرماتے ہیں:

"وبعثهم فی سبیل محبّتہ"

اور یہ بھی بتایا جا چکا ہے کہ عالی مقام علامہ سیّد علی خان مدّنی شیرازی قدس سرہ، فرماتے ہیں: ضمیر کی طرف اضافۂ محبّت مفعول کی سمت اضافۂ مصدر کے سبب ہے۔ پس اس صورت میں صحیفہ کے جُملے کا حاصلِ مطلب یہ ہوگا کہ: خداوندِ عالم نے بندوں کو اپنی محبت عطا کی ہے یعنی بندے فطری طور پر خدا دوست ہیں: ؎

سالہا دل طلب جام جم از ما می کرد
آنچہ خود داشت ز بیگانہ تمنا می کرد

اس وضاحت کے ساتھ شاید "فاطلب فی نفسک حقیقۃ العبودیۃ" کی تفسیر یہ ہو کہ: ہوا و ہوس کو ایک طرف رکھو، جہاں تک ہو سکے نفسِ امارہ کی مخالفت کرو تاکہ گوہرِ مخفی (یعنی حُبِّ الٰہی) فعلیت میں آئے اور تمہارے اندر کی تشنگی میں حقیقتِ ظہور پیدا ہو۔ ؎

آب کم جو تشنگی آور بہ دست
تا بجوشد آبت از بالا و پست

آخری نتیجہ

میرے عزیز قارئین اسلام، کہ جو بطورِ مسلّم خداوند تبارک وتعالےٰ کا سب سے بڑا اور سب سے جامع دین ہے کئی مراتب اور کئی مراحل کا حامل ہے، اس کا ظاہر بھی ہے اور باطن بھی اور وہ اسرار بھی کہ جس کے سمجھنے کے لئے محرومیت ضروری ہے اور یہ محرمیّت صرف اور صرف عمل، مجاہدات، ریاضات اہلِ بیت عصمت و طہارت صلوات اللہ علیہم کی رہنمائی اور مصباحِ ولایت سے کسبِ فیض کے ذریعے حاصل ہوتی ہے۔ مدرسہ، کتاب اور سبق یا درس، فہم کا پیش خیمہ ہے، فہم، عمل کا آغازِ کار ہے اور عمل اسی محرمیّت

کا مقدمہ ہے۔

جمال السالکین عظیم المرتبت علامہ، عالی نسب سیّد جناب رضی الدین علی بن موسیٰ بن جعفر بن طاؤس، الحسنی والحسینی کہ جو "ابنِ طاؤس" یا "سیّد ابنِ طاؤس" کے نام سے مشہور ہیں اعاظم علماء شیعہ سے ہیں اور ان کا علم، زہد، تقوی اور عبادت ہر بڑے عالم کے نزدیک مسلّم ہے ان کی کتابوں سے استفادہ ہوتا ہے کہ انکے پاس اپنے وقت کا ایک ایسا عظیم کتب خانہ تھا کہ جو بے نظیر نہیں تو کم نظیر ضرور تھا اور حالت یہ تھی کہ ان کتابوں کی فہرست نے خود ایک حیرت انگیز کتاب کی صورت اختیار کرلی تھی کہ جس کا نام انھوں نے "الإبانة فی معرفة اسماء کتب الخزانه"[1] رکھا تھا۔ اس اعلیٰ مدارج کی حامل ہستی نے ان ڈھیر ساری کتابوں اور ان میں اس قدر دلچسپی اور تخصص کے باوجود وہ آخری بات جو کتب خانہ اور اپنی تالیفات کی مفصّل توصیف کے بعد اپنے بیٹے سے اپنی وصیّت میں کہی تھی:

«ان عاملت الله۔ جل جلاله بالصدق والتحقیق جعل قلبک مرآة تنظر بها ما یریده۔ جل جلاله۔ من العلوم من وراء ستر

۱: اس حقیر کے پاس "فہرست نویسان در تاریخ اسلام" کے نام سے کچھ ناقابلِ ذکر اوراق ہیں جنھیں اس نے بڑی زحمتوں کے بعد تالیف کی منزلوں سے گزارا اور اب تقریباً مکمل ہو کر طباعت کے لئے آمادہ ہے، مجھے امید ہے کہ انشاءاللہ تعالیٰ دوستوں کی دعاؤں سے وہ بہت جلد تحقیق کے دلدادہ افراد کے ہاتھوں تک پہنچ جائے۔ میں نے اس عالیقدر سیّد اور ان کی فہرست کا تذکرہ اس کتاب میں کیا ہے اور انکی تالیفات کی توصیف میں بہت کچھ گفتگو کی ہے۔

رقیق؛ ففی اخبار صاحب الملّة: المؤمن ینظر بنور اللّٰہ»۔[1]

ترجمہ:

میرے بیٹے، اگر تم حقیقت اور سچائی کے ساتھ خدائے بزرگ و برتر کے ساتھ معاملہ کروگے تو وہ ذاتِ پاک تمھارے قلب کو ایک ایسا آئینہ قرار دیگا کہ جس میں تم ان علوم کو ایک دقیق پردے کی پشت سے دیکھوگے جنھیں خداوندِ عالم تمھارے لئے پسند فرمائے گا، اس لئے کہ صاحبِ شریعت کی روایت میں یہ بات آئی ہے کہ "مومن خدا کے نور سے دیکھتا ہے"

برادرِ عزیز، اس طرح کی گفتگو سنکر کیا یہ اندازہ نہیں ہوتا کہ بولنے والا کس قدر صاحبِ کرامت، علم لدّنی سے مالامال اور منفرد خصوصیات کا حامل رہا ہے۔ وہ کتابوں کی توصیف کے بعد اپنے ان بلند پایہ معروضات کو پیش کرتا ہے اور سمجھتا ہے کہ کتاب ایک بہت اچھّی اور مفید چیز ہے بشرطیکہ اس میں صرف طریقیت ہو، بے شک اس کتاب اور اس مدرسہ سے بیزاری ہی بھلی ہے کہ جو انسان کو سید بن طاؤس یا حضرت امام خمینیؒ کے درجہ تک نہ پہنچا سکے اور "از مسجد واز مدرسہ بیزار شدم" کے یہی معنیٰ ہیں۔

واللہ یقول الحق وھو یھدی السبیل۔

۱: کشف المحجّة ص ۱۳۶۔ مطبوعہ نجف اشرف

قال سیّد الاماجد والجامع من شرف النسب بین الطریف والتّالد طیّب اللہ تربتہ:

جامۂ زہد و ریا کندم و بر تن کردم
خرقۂ پیر خراباتی و ہشیار شدم

شرحِ اصطلاحات اور مفرد الفاظ کی توضیح:

"جامۂ زہد و ریا کندم" سے مُراد ریا سے دوری ہے اور زہد کا ریا کے ساتھ تذکرہ یہ بتاتا ہے کہ یہاں زہد اپنے اصلی مفہوم میں استعمال نہیں ہوا ہے بلکہ اس سے مُراد ریائی زہد ہے۔ وگرنہ زہد، حقیقی معنوں میں مراحلِ سلوک میں سے ایک مرحلہ اور

مقربین کے درجات میں سے ایک درجہ ہے۔

"خرقہ" وہ پہناوا ہے جو پھٹے پرانے کپڑوں کو ایک دوسرے سے جوڑ کر بنایا جاتا ہے۔

"خرابات" میخانہ۔

"ہشیار" عاقل، زیرک، واقف و آگاہ۔

عرفانی تفسیر :-

"خرقہ" کی بحث اہلِ تصوف کی اصطلاح میں ایک مفصّل گفتگو ہے اور ہم اسے یہاں ضروری نہیں سمجھتے، البتہ اجمالاً عرض ہے کہ اہل عرفان میں سے بعض بزرگوں نے اسے "صلاحیت" کی طرف کنایہ قرار دیا ہے۔ اور آپ اسے ناظم، قدس اللہ سرہٗ۔ کے شعر میں اسی مفہوم کے ساتھ دیکھیں گے۔

"پیر خراباتی" کشاف میں آیا ہے کہ: "کامل و اکمل لوگوں کو کہا جاتا ہے" شعر یہ ہے ؎

ہر کو بہ خرابات نشد بی دین است

زیرا کہ خرابات اصولِ دین است

اس خراب شدن سے مراد صفاتِ بشریہ کا خراب ہونا ہے"[1]

---

[1] : کشّاف - ۲/۱۵۵۴ - مطبوعہ کلکتہ

نتیجہ

اس شعر کے مفہوم میں دو صورتیں دکھائی دیتی ہیں۔

الف: ریا وغیرہ جیسے اخلاقِ مذمومہ سے دوری اور دنیا اور تعلقاتِ دنیا سے کنارہ کشی انسان میں یقینی طور پر معارف اور حقائقِ اسرار کو جنم دیتے ہیں۔ اس صورت میں کامل و اکمل افراد اسے اپنی طرف جذب کرتے ہیں اس کی تربیت پر اپنی کوشش صرف کرتے ہیں اس لئے کہ کوئی خواہ کتنا ہی زہد و پاکی سے متصل ہو اسرار اور فیضانِ علوم، کامل اُستاد کے بغیر ہاتھ نہیں آتا۔

من بہ سر منزل عنقا نہ بہ خود بردم راہ
قطع این مرحلہ بامرغ سلیمان کردم

ب: دُنیا سے لاتعلقی، سچّا زہد اور مولانا روم کے اس شعر کی حقیقت کے ساتھ کہ: ؎

چیست دُنیا از خدا غافل بدُن
نی قماش و نقرہ و فرزند و زن

عام مفہوم میں دُنیا کی محبّت کا دل سے اخراج،

جنابِ رسولِ خدا صلّی اللہ علیہ وآلہ وسلّم اوران کے اہلِ بیت طاہرین صلوات اللہ علیہم کے ہمراہ حشر ونشر کا باعث ہوتا ہے اور یہی وہ ذاتِ مقدسہ ہیں کہ جو دُنیا وآخرت میں کاملیت اور اکملیت کے درجہ پر فائز ہیں اور جب تک دل سے حُبِّ دنیا نہیں جائے گی یہ حشر وہمراہی حاصل نہیں ہوگی، حضرت علی بن الحسین زین العابدین سلام اللہ علیہما۔ ابوحمزہ کے پراسرار دُعا میں ارشاد فرماتے ہیں:"

«سیّدی اخرج حبّ الدنیا من قلبی و اجمع بینی و بین المصطفی خیرتک من خلقک و خاتم النّبیین محمّد صلی الله علیه و آله.»

ان جُملوں سے اندازہ ہوسکتا ہے کہ دُنیا وآخرت میں دوستانِ خدا کے ساتھ الحاق اور دل سے دُنیا کی محبّت کا اخراج دونوں ایک دوسرے کے لئے لازم وملزوم ہیں۔

"ہشیار شدن" کے بارے میں حضرت امام جعفر صادقؑ کا ایک عجیب مفہوم!

حضرت صادقؑ فرماتے ہیں «دعامة الإنسان العقل؛ والعقل منه الفطنة والفهم والحفظ والعلم؛ و بالعقل یکمل؛ و هو دلیله و مبصره و مفتاح امره؛ فاذا کان تأیید عقله من النّور کان عالماً؛

حافظاً؛ ذاكراً؛ فطناً؛ فهماً؛ فعلم بذلک کیف؛ و لم؛ و حیث؛ و عرف من نصحه و من غشّه، فاذا عرف ذلک عرف مجراه و موصوله و مفصوله؛ و أخلص الوحدانیّة لله؛ والإقرار بالطّاعة؛ فاذا فعل ذلک کان مستدرکاً لمافات؛ و وارداً علی ماهوآت، یعرف ماهوفیه؛ ولأیّ شیئ هو ههنا؛ و من این یأتیه؛ و الی ماهوصائر؛ و ذلک کلّه من تأیید العقل.»

ترجمہ :-

انسان کی شخصیّت اور اس کی ہستی کا ستون عقل ہے، عقل، ہوشیاری، فہم، تحفظ اور دانش کا سرچشمہ ہے اور انسان اسی کے ذریعے کمال تک پہنچتا ہے، عقل، راہ نما، چشم گشا اور انسان کے لئے عمل کی چابی ہے، جب انسان کی عقل، نور سے مؤید و منور ہوتی ہے تو وہ دانش مند ذاکر، حافظ اور اہلِ فکر و نظر ہو جاتا ہے اور اسی رو سے کیوں؟ کہاں، اور کس طرح کو سمجھتا ہے اور اپنے خیر خواہ اور بد خواہ کی شناخت کرتا ہے اور جب یہ شناخت ہو جاتی ہے تو وہ اپنی راہ و روش اور تعلق و قطع تعلق سے واقف ہو جاتا ہے اور یگانہ پرستی اور فرمانبرداری میں اخلاص برتتا ہے اور جب ایسا کرتا ہے تو اپنی کھوئی ہوئی چیز کو پالیتا ہے اور مستقبل پر مُسلّط ہو جاتا ہے اور پہچانتا ہے اس کو جس میں کہ وہ ہے (شاید اس سے مُراد حال یا مقام ہو) یعنی وہ جانتا

ہے کہ کس حالت میں ہے اور کس بات کے لئے اس مقام پر ہے؟ (گویا دنیا میں یا اس حال اور کیفیت میں) اور کہاں سے اسے ملتا یا پہنچتا ہے اور وہ خود کہاں جائے گا۔ یہ سب باتیں (یہ مراتب) عقل کی تائید سے حاصل ہوتی ہیں۔[1]

جمال السالکین مجلسیِ اوّل۔ نوراللہ تربتہ کہتے ہیں «اعلم أنّ هذا الخبر مشتمل على حقائق كثيرة، و لا يمكن بيانه؛ لأنّ هذه أحوال أوليائه تعالى الذين نوّروا عقولهم بأنوار الذكر الدائم حتّى صار قلوبهم خزائن الله تعالى، و يلهمون في كل آن بما يحتاجون اليه من الترقي الى المراتب العالية من محبّته و معرفته و قربه و وصاله، اوصلنا الله تعالى و سائر المؤمنين اليها.»[2]

ترجمہ:

واضح رہے کہ یہ حدیث اتنے زیادہ حقائق کا حامل ہے کہ جسے بیان کرنا ہمارے بس کی بات نہیں ہے اس لئے کہ اس میں دوستانِ خدا کے کیفیات ہیں اور یہ وہ لوگ ہیں کہ جنھوں نے اپنی عقلوں کو (قلبی اور لسانی طور پر) دائمی ذکر سے منوّر کر رکھا ہے جس کے نتیجے میں ان کے دل عرفان اور اسرارِ الٰہی کے خزانے بن گئے ہیں اور مراتب کی بلندی، محبّت، معرفت اور قرب و وصالِ حق سے متعلق جو بھی وہ چاہتے ہیں ان پر الہام ہوتا رہتا ہے۔ خداوندِ تبارک و تعالےٰ ہمیں اور دیگر

۱: روضۃ المتقین ۱۲/۲۴۳ ۲۔ اصول کافی ج ۱ حدیث ۲۳

اہلِ ایمان کو بھی اس مرتبہ پر فائز کرے۔

مفیدِ عام اختتام

(صاحبِ بحار) علامہ مجلسی قدس اللہ سرہ وحشرنا معہ۔ اس حدیث کی شرح میں فرماتے ہیں:

"واضافة التاييد الى العقل امّا الى الفاعل أو الى المفعول فتفطن"

یعنی عقل کی طرف اضافۂ (تائید) فاعل اور مفعول میں سے کسی ایک سمت اضافۂ مصدر کے اعتبار سے ہے، پس عقل و ہوش سے کام لو، یعنی غور و فکر کو کام میں لاؤ۔ (مجلسی کی یہ بات یہاں اختتام کو پہنچتی ہے)

حقیر عرض کرتا ہے: اضافہ مفعول کی طرف ہے، اس لئے کہ حدیث ذکرِ عقل کی منزل میں مؤیّد ہے، فرماتے ہیں:

"فاذا كان تاييد عقله من النور"

"پس تم بھی عقل و ہوش سے کام لو۔"

قال سیّد الفحول والمقتلذ من مجتہ الزہراء البتول (صلوات اللہ علیہا) الامام خمینی نور اللہ مضجعہٗ:

واعظ شہر کہ از پند خود آزارم داد

از دم رندی آلودہ مددکار شدم

اصطلاحات اور مفرد الفاظ کی شرح

"واعظِ شہر" حقیقت سے بے خبر ملامت گر انسان کی طرف اشارہ ہے یا پھر اس سے مُراد وہ لوگ ہیں کہ جو سماج میں علمائے دین کے نام سے مشہور ہیں اور دین سے صرف ظاہری باتوں کو جانتے ہیں اور اس کی روح اور حقیقت تک ان کی رسائی نہیں ہے۔" ۱

۱: یہ حقیر کا خیال ہے، ضمناً تمہید سے رجوع فرمائیں۔

"دم" لغت میں سانس یا نَفَس کو کہا گیا ہے مگر ساتھ ہی ورد اور دعا کے معنوں میں بھی آیا ہے، فردوسی کہتے ہیں: ؎

بیامد برین بارہ بر منجنیق
زافسون تو رودم جا ثلیق [1]

"رند" چارہ گر، باسمجھ، بے باک، قید و بند سے آزاد، ایک ایسا شخص کہ جو اپنے آپ کو معرضِ ملامت میں قرار دے، لوگ اسے بُرا بھلا کہیں وہ ایک اچھے اور صحت مند باطن کا حامل ہو۔

یہ لفظ عرفانی غزلوں میں بہت استعمال ہوا ہے اور اس کے لئے شواہد کی ضرورت نہیں ہے۔

"مے آلود" مخمور اور شراب خوار کی طرف اشارہ ہے، سعدی کہتے ہیں:

"مے آلودہ ای راہ مسجد گرفت" [2]

۱: دلیل کے طور پر پیش کرنے والے اس شعر کو میں نے "لغت نامہ دھخدا" سے لیا ہے۔

۲: مرحوم دھخدا نے اسی مصرعہ سے دلیل دی ہے لیکن مرحوم فروغی اور "شوریدہ" کے نام سے چھپنے والی سعدی میں "می آلودہ ای" کے بجائے "گل آلودہ ای" آیا ہے، شاید یہ بات قرینِ قیاس ہو کہ بعد کے اشعار میں آنے والا سیاق کلام دھخدا کے تحریر کی تائید کرتا ہے مگر یہ کہ ہم اسے "گل آلود" والی حکایت سے الگ دوسری حکایت کا مطلع قرار دیں البتہ یہ فرضیہ بھی بعید از قیاس ہے۔ بہر حال جو بھی ہو، جو حکایت اس حقیر نے بوستان میں دیکھی ہے اس کے پہلے دو شعر اس طرح سے ہیں: ؎

گل آلودہ ای راہ مسجد گرفت — زبخت نگوں بود اندر شگفت
یکی زجبر کردش کہ تبت یداک — مرو دامن آلودہ برجای پاک

عرفانی تفسیر

شاید "واعظ شہر" سے مراد کچھ کم فہم، ظاہر بین اور عالم نما افراد ہوں کہ جو اہلِ معرفت کی قربت اور اُن کے انفاسِ قدسیہ سے حصولِ فیض کے باب میں لوگوں کو روکتے ہوں اور انھیں محرومیت سے دوچار کرتے ہوں اور ان کے "اذیت رساں پند" سے مراد ان کی یہی ممانعت اور ناقص استدلال پر مبنی لغو گفتگو ہو۔

حضرت امام قدس سرہ نے سورۂ حمد کی تفسیر میں خود اس مفہوم کی طرف اشارہ فرمایا ہے۔[1]

"رند" صاحبِ کشاف کہتے ہیں "رند" سالکوں کی اصطلاح میں شراب خوار اور شراب فروش کو کہا جاتا ہے کہ جو نیستی یا فنا کی شراب پلا کر سالک کی ہستی کو مول لیتا ہے۔

۱: یہ حقیر پچھلے دنوں ایران میں مرکز سے دور واقع شہروں میں سے ایک شہر میں کسی اہلِ اللہ سے ملنے پہنچا۔ لیکن اس سے پہلے میری ملاقات اس شہر کے ایک امام جماعت سے ہوئی جو قم میں میرے ساتھ ہوا کرتا تھا اور اس سے میری پرانی واقفیت تھی۔ تھوڑی سی گفتگو اِدھر اُدھر کی باتوں کے بعد جب اسے یہ معلوم ہوا کہ میں اس بزرگ سے ملنے آیا ہوں تو اس کا چہرہ متغیر ہوا اور طنزیہ انداز میں کہا: ہاں، انھیں کون نہیں جانتا۔ سب پر اُن کا حال منکشف ہے (یا اسی طرح کی کوئی اور بات کہی) وہ امام جماعت ایک اچھا آدمی تھا لیکن یہاں بات ظرفیت کی ہے۔ حضرتِ شاہ ولایت۔ صلوات اللہ علیہ ارشاد فرماتے ہیں:

"یا کمیل ان ھذہ القلوب اوعیۃ، فخیرھا اوعاھا"

"مے" کے بارے میں صاحبِ کشاف کہتے ہیں: "مے ان کے نزدیک وہ جذبہ اور شوق ہے کہ جو سالک کے دِل سے نکلتا ہے اور اسے خوش قسمت بنا دیتا ہے۔ اس کے علاوہ یہ لفظ محبت اور عشق کے معنوں میں بھی آتا ہے۔"

نتیجہ

اس شعر کی تفسیر میں بہت سی باتیں سامنے آتی ہیں جن میں سے ایک یہ ہے کہ کم علم اور ظاہر بین افراد کی اذیت رساں نصیحت پر کان نہ دھرنا اور مے آلودہ رندوں کے دم سے مدد لینا اپنے آپ کو شرابِ محبّت سے مست کامل و اکمال لوگوں کی تربیت میں دینا ہے کہ جو حضرت امام۔ نور اللہ تربتہ کے اساتید سے عبارت ہیں۔

اور دوسری بات وہی تمام گفتگو ہے جسے ہم ابتدا میں عرض کر چکے ہیں اور اب مزید اس کی تکرار مناسب نہیں۔

قال سیّد الحکماء نور اللہ مثواہ :

بگذارید کہ از بت کدہ یادی بکنم
من کہ با دست بُت میکدہ بیدار شدم

اصطلاحات اور مفرد الفاظ کی شرح

"بُتکدہ" بُتوں کی جگہ، وہ مقام جہاں پر بُتوں کو رکھا جاتا ہے۔"

"بُت" لغت میں "صورت" سے عبارت ہے جسے پوجا جائے اب خواہ وہ لکڑی کی ہو یا پتّھر کی۔ شعراء کی اصطلاح میں اس سے مُراد محبوب و معشوق ہے۔

"میکدہ" شراب خانہ، مے خانہ، خمار خانہ، خرابات، وہاں جہاں شراب پی جاتی ہے یا بیچی جاتی ہے۔

"بیدار" خفتہ یا مدہوش کی ضد، "غیاث اللغات" کے مؤلف (مطبوعہ ہندوستان۔ کہ جس کے حاشیہ نگار "چراغ ہدایت" میں صفحہ ۷۸ پر) لکھتے ہیں: "بیدار" مرکب ہے "بید" اور "دار" سے جس کے دال کو حذف کر دیا گیا ہے یا پھر یہ لفظ "بید" اور "آر" ہے کہ جو کلمۂ نسبت ہے اور "بید" شعور کو کہتے ہیں۔

عرفانی تفسیر:

صاحبِ کشاف کہتے ہیں: "بتکدہ .... عارفِ کامل کے اس باطن کو کہتے ہیں کہ جس میں شوق وذوق کا سمندر موجزن ہو۔[1]

"بت" عرفاء کی زبان اور ان کی اصطلاح میں بہت سے مفہوم کا حامل ہے جس کے بیان کو ہم ضروری نہیں سمجھتے ان میں سے ایک "پیرِ کامل" ہے۔

"میکدہ" قدمِ مناجات کو کہتے ہیں۔[2]

۱: مطبوعہ کلکتہ ۲/ ۱۵۵۳

۲: کشاف ۲/ ۱۵۶۳

بنیادی عرفانی تفسیر

حقِ سبحانہ تعالےٰ کی "خلقتِ اوّل یا پہلے وجود" کی بحث، حکماء اور عرفاء کے درمیان ایک نہایت نازک بلند اور طویل بحث رہی ہے۔ یہاں میں تفصیل کے ساتھ اس بحث میں جانا نہیں چاہتا اور نہ ہی اس کے اصطلاحات، عناوین اور قواعد پر گفتگو میرا مطمعِ نظر ہے۔ اجمالاً عرض کرتا ہوں: محققین اور علماء امامیہ قدس اللہ اسرارہم کے اربابِ بصائر کا جن میں حکماء، عرفا، محدثین، فقہا اور متکلمین علی اختلاف فی مشاربہم واذواقھم۔ سبھی شامل ہیں متفق علیہ فیصلہ ہے کہ وہ پہلی خلقت جو مبدءِ متعال اور دیگر مظاہرِ خلق کے درمیان واسطۂ فیض ہے جناب ختمی مرتبت محمد بن عبداللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے نورِ اقدس سے عبارت ہے کہ جسے بعض علماء نے "حقیقتِ محمدیہ" سے تعبیر کی ہے۔ البتہ آپ کے اہلِ بیت طاہرین صلوات اللہ علیہم کے انوارِ مقدسہ بھی عین آپ ہی کے نور اور اصلِ واحد ہیں۔

یہ بات ان معتبر اور کثیر روایتوں سے لی گئی ہے کہ جو بہت دقیق اور لطیف نکات اور نوریہ اشارات کی حامل ہیں۔ ان روایات میں "نور"، "کلمہ"، "اشباح"، "روح"، "ظل اور اظلہ" جیسے عرشیہ الفاظ پائے جاتے ہیں کہ جن کو سمجھنے سے عقل قاصر ہے اور صرف وہی

محرمانِ اہلِ بیت علیہم السّلام۔ انھیں سمجھ سکتے ہیں کہ جو اربابِ ریاضات و مجاہدات ہوں اور طہارتِ نفس رکھتے ہوں۔ یہاں ان نورانی احادیث کی چند مثالیں پیش کی جاتی ہیں:

۱ - «عن جابر بن عبدالله قال: قلت: لرسول الله - صلی الله علیه وآله - اول شیئ خلق الله تعالی ماهو؟ فقال: نور نبیّک یا جابر، خلقه الله ثمّ خلق منه کلّ خیر.» (۱)

ترجمہ:

جابر بن عبداللہ انصاری فرماتے ہیں میں نے جناب رسالتمآب صلّی اللہ علیہ وآلہ وسلّم سے پوچھا: وہ پہلی چیز جسے خداوندِ عالم نے خلق فرمایا کون سی ہے؟ آپؐ نے فرمایا: جابر، وہ تمھارے پیغمبرؐ کا نور ہے، خدا نے اُسے خلق کرکے ہر خیر کو اس سے پیدا کیا۔ اس حدیث میں "ثم خلق منه کل خیر" کا جُملہ بہت دقیق اور قابلِ تدبر و تعمق ہے۔

۲- حضرت باقر العلوم- صلوات الله علیه- فرمود: «کان الله و لاشیئ غیره؛ لامعلوم و لامجهول؛ فأوّل ما ابتدأ من خلقه أن خلق محمّداً- صلی الله علیه و آله- و خلقنا اهل البیت معه من نور عظمته؛ فأوقفنا أظلّة خضراء بین یدیه؛ حیث لاسماء و لاارض و لامکان؛ و

۱: بحارالانوار ۱۵/۲۴

لا لیل و لا نہار و لا شمس و لا قمر» [1]

ترجمہ:

جب کوئی شئے نہ تھی خدا تھا۔ سوائے اس کے معلوم و مجہول میں کوئی نہ تھا۔ پس ابتدار خلقت میں اس نے جناب رسالتمآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلّم اور ہم اہل بیت کو ان کے ساتھ اپنی عظمت کے نور سے خلق کیا۔ اس کے بعد اس نے ہم کو سایوں کی صورت میں اپنے پاس رکھا جہاں نہ آسمان تھا اور نہ زمین، نہ مکان تھا نہ مکین، نہ شب تھی اور نہ روز، نہ سورج تھا اور نہ چاند۔

۳۔ جناب رسالتمآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں:

«لمّا اراد الله أن يخلقنا تكلّم بكلمة خلق منها نوراً؛ ثمّ تكلّم بكلمة أخرى فخلق منها روحاً، ثمّ مزج النور بالرّوح فخلقني و خلق عليّاً و فاطمة والحسن والحسين، فكنّا نسبّحه حين لا تسبيح؛ و نقدّسه حين لا تقديس ۰» [2]

ترجمہ:

"جب خداوندِ عالم نے ہماری خلقت کا ارادہ کیا تو ایک کلمہ سے کلام کیا کہ جس سے اس نے ایک نور کو خلق فرمایا: اس کے بعد ایک دوسرے کلمہ سے تکلّم کیا اور اس سے ایک روح کی خلقت ہوئی

۱: بحار الانوار ۱۵/۲۳   ۲: بحار الانوار ۱۵/۱۰

اس کے بعد اس نے نور کو روح کے ساتھ امتزاج دیا اور پھر مجھے علیؑ فاطمہؑ اور حسنؑ و حسینؑ کے ساتھ خلق فرمایا، پس ہم نے اس کی تسبیح و تقدیس کی جب نہ کوئی تسبیح تھی اور نہ تقدیس۔"

جیسا کہ میں عرض کر چکا ہوں یہ احادیث نکاتِ نوریہ، اشاراتِ عرشیہ اور بہت عمیق مطالب و مفاہیم سے آراستہ ہیں اور صرف ترجمہ سے ان کا حق ادا نہیں ہوتا۔

صاحبِ فتوحات کی بات

شیخ صاحب "فتوحاتِ مکیّہ" کے چھٹے باب میں لکھتے ہیں:

«کان الله و لا شیئ معه؛ ثمّ أدرج فیه؛ و هو الان علی ما علیه کان لم یرجع الیه من ایجاده العالم صفة ما لم یکن علیها؛ بل کان موصوفاً لنفسه و مسمّی قبل خلقه بالأسماء الّتی یدعوه بها خلقه. فلمّا اراد وجود العالم و بدأه علی حدّ ما علمه بعلمه بنفسه؛ انفعل عن تلک الإرادة المقدّسة بضرب تجلّ من تجلّیات التنزیه الی الحقیقة الکلیّة حقیقة تسمّی الهباء؛ هی بمنزلة طرح البناء الجصّ لیفتح فیه ما شاء من الأشکال والصّور و هذا هو اوّل موجود فی العالم و قد ذکره علی بن ابی طالب رضی الله عنه : ثمّ انه سبحانه و تعالی تجلّی بنوره الی ذلک الهباء؛ و یسمیّه اصحاب الأفکار بهیولی الکل؛ والعالم کلّه فیه بالقوّة

والصّلاحيّة؛ فقبل منه تعالى كل شيئ فى ذلك الهباء على حسب قوّته و استعداده؛ كقبول زوايا البيت نور السراج؛ و على حسب قربه من ذلك النّور يشتدّ ضوءه و قبوله؛ قال تعالى: «مثل نوره كمشكاة فيها مصباح» فشبّه نوره بالمصباح؛ فلم يكن اقرب اليه قبولاً فى ذلك الهباء الا حقيقة محمّد- صلّى الله عليه و آله- المسّماة بالعقل؛ فكان مبتدأ[1] العالم بأسره و اوّل ظاهر فى الوجود؛ فكان وجوده من ذلك النّور الإلهى و من الهباء و من الحقيقة الكليّة؛ و فى الهباء وجد عينه و عين العالم من تجلّيه، و اقرب النّاس اليه على بن ابى طالب رضى الله عنه امام العالم و سرّ الأنبياء اجمعين.» [2]

شیخ اپنی گفتگو کے اس حصّے میں کہتے ہیں: وجود میں آنے والا پہلا ظہور، ذاتِ محمدیہ کی حقیقت ہے کہ جسے "عقل"[3] کہا جاتا ہے۔

۱: فتوحاتِ مکیّہ مطبوعہ (بولاق) ۱۲۹۳ھ ق۔ ج ۱۔ ص ۱۵۴ اور ج ۱۔ ص ۱۱۹ مطبوعہ مصر (جو ۴ جلدوں پر مشتمل ہے اور بیروت میں آف سیٹ ہوئی) ۲۔ "سیّد عالم" کی بیروت کی آفسٹ، مطبوعہ مصر سے ماخوذ۔

۳: صدرالحکماء کہتے ہیں: حقیقتِ محمدیہ کو کبھی عقل، کبھی روح، کبھی نور اور کبھی قلم کہا گیا ہے:

«و لاشكّ ان اشرف الممكنات و اكرم المجعولات هوالعقل كما علمت؛ فهو اوّل الصوادر واقربها من الحق... و هذا الموجود حقيقة؛ حقيقة الروح الأعظم بعينها المشار اليه بقوله تعالى: قل الروح من امر ربّى؛... و انما سمّى بالقلم لأنه واسطة الحق فى تصوير العلوم والحقائق على الألواح النفسانيّة القضائيّة والقدريّة... و لكونه وجوداً خالصا عن ظلمة التجسّم والتحجّت و عن ظلمات النقائص والأعدام يسمى نوراً؛ اذا النور هو الوجود؛ والظلمة هى العدم؛ و هو ظاهر لذاته مظهر لغيره؛ و لكونه اصل حياة النفوس العلويّة و السفليّة يسمى روحاً، و هو الحقيقة المحمديّة- صلى الله عليه و آله- شرح اصولِ کافی پتھر کی چھپائی، پہلی حدیث۔

عارف قناری نے مصباح الانس میں فتوحات ہی کے کسی اور مقام سے نقل کیا ہے کہ شیخ کہتے ہیں: «بدء الخلق الهباء؛ و اول موجود فيه الحقيقه المحمّديّة۔ صلى الله عليه و آله۔.» [1]

قناری اسی صفحہ پر لکھتے ہیں: «و انّما قال الشيخ الكبير فى الحقيقة المحمديّة: المسمى بالعقل الأول؛ اذ كان مراده۔ والله اعلم۔ روحه و نفسه الشريفة المقدّسة؛ كما مرّ؛ فانّ حقيقته باتّفاق المحققين هى حقيقة الحقائق.»

شیخ کی گفتگو میں ایک اہم بنیادی بات

جہاں وہ فرماتے ہیں:

«... و كان اقرب الناس اليه على بن ابى طالب (عليه السلام)

---

[1] شیخ کہتے ہیں: (اہلِ فلسفہ ھباء سے ہیولیٰ کی تعبیر کرتے ہیں، ھیولیٰ، عرفِ فلاسفہ میں مادہ عالم ہے۔ عرفاء بعض اوقات اسے عنقا کہتے ہیں۔ میرے محترم قارئین شیخ کے گفتگو کی مکمل شرح ہمارا مدعا نہیں ہے اس لئے کہ اس کے لئے خود ایک رسالہ کی ضرورت ہے، ہم صرف ان کی گفتگو سے اس حصّے کو نقل کرنا چاہتے تھے جو ہماری بات پہ دلیل ہو۔

امام العالم و سرّ الأنبياء اجمعين»[1]

ان کا حال کلام یہ ہے کہ ابتداء خلقت میں حقیقت محمدیہ سے قریب ترین ہستی۔ علی بن ابی طالب۔ صلوات اللہ علیہ کی ذاتِ گرامی تھی کہ جو تمام عالم کے امام اور تمام پیغمبروں کے سربستہ راز ہیں۔

۱: یہ بات چار جلدوں میں چھپنے والی فتوحات میں (کہ جو بیروت میں آف سٹ ہوئی ہے اور اصل چھپائی مصر کی ہے) جس طرح آئی ہے وہ اس عبادت سے مختلف ہے جسے بولاقِ مصر نے چھاپا ہے۔ حالانکہ بولاق مصر کا نسخہ چار جلدوں میں چھپنے والے نسخہ سے زیادہ قدیم ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اہلِ بیتؑ وحی و عصمت علیہم السّلام سے دشمنی رکھنے والا ہاتھ چار جلدوں میں چھپنے والی فتوحات کی سمت دراز ہوا ہے، عبدالوہاب شعرانی کہ جو مصر کے برگزیدہ عرفاء میں سے ہے اپنی کتاب (الیواقیت والجواھر، جلد ۱ ص ۳) میں لکھتے ہیں: (شیخ عارف ابوطاہر مزنی شاذلی نے مجھے خبر دی ہے کہ بعض باتیں شیخ کی کتابوں میں چالبازانہ اور تحریفانہ ہے۔

حد سے تجاوز کرنے والے اس ہاتھ نے امام زمانہ صلوات اللہ علیہ و علیٰ آبائہ الطاہرین کی نسبت "فتوحات" میں اپنی بددیانتی کا اظہار کیا ہے لیکن ولایتِ باطن نے اس کو رسوا کیا جس کی تفصیل آپ یہاں ملاحظہ فرمائیں گے۔

شیخ نے فتوحات میں کئی مقامات پر امام زمانہ علیہ السلام کا تذکرہ کیا ہے اور کہا ہے کہ آپ امام حسین علیہ السّلام کی اولاد سے ہیں، لیکن اس بددیانت ہاتھ نے شیخ کی تحریروں میں آئے ہوئے لفظ "حسین" کو ہر جگہ اذہان کو منحرف کرتے

←

کے لئے "حسن" میں تبدیل کیا ہے، اس حقیر نے اب تک فتوحات کی تین طباعتیں دیکھی ہیں: الف۔ بولاق کا نسخہ، ب۔ بولاق کے بعد چھپنے والا نسخہ، ج، دار الکتب العربیہ بمصر علی نفقۃ الحاج محمد قدا الکشمیری" کا نسخہ ان تینوں نسخوں میں اس بددیانتی کا منہ بولتا ثبوت موجود ہے۔

اس بددیانتی کا انکشاف

یہ بددیانت انسان اس بات سے غافل تھا کہ اور بھی ایسے سنی علماء مصر اور دوسری جگہوں پر ہیں جن کے پاس فتوحات کے نسخے موجود ہیں اور انہیں میں سے ایک شخصیت شعرانی کی ہے جن کا ذکر ابھی ہم اوپر کر چکے ہیں۔

امام زمانہ کے بارے میں "فتوحات" کی وہ عبارات جنھیں شعرانی نے نقل کیا ہے

شعرانی ۱۳۷۸ھ ق میں چھپنے والی کتاب "الیواقیت الجواھر" مطبوعہ مصر کی دوسری جلد میں صفحہ ۱۴۳ پر لکھتے ہیں۔

حضرت شاہ ولایت ارواحنا فداہ کا سرِ انبیاء ہونا ایک بہت گہرا عرفانی اور اعتقادی مسئلہ ہے، چنانچہ سنّی، شیعہ روایتیں اس حقیقت پر گواہ ہیں، یہاں میں سمندر سے قطرہ کی مثال صرف ایک حدیث نمونتاً اور تبرکاً پیش کرتا ہوں۔

حاکم نیشاپوری نے کہ جن کا شمار اہلِ سنّت کے انتہائی قابلِ احترام بلند پایہ علما اور محدثین میں ہوتا ہے اور "مستدرک علی الصحیحین" سے متعلق ان کی شہرۂ آفاق کتاب نے پوری دنیا میں ان کا چرچا کر رکھا ہے۔ "معرفتہ علوم الحدیث، مطبوعہ ہندوستان، دائرۃ المعارف العثمانیہ" کی کتاب صفحہ ۹۶ میں کہ جو انتہائی محتاط انداز کی تصحیح کے ساتھ ۱۹۳۵ء میں کئی خطی نسخوں سے موازنہ کے بعد شائع ہوئی ہے اور اس کا مقدمہ ۲۹ صفحوں پر مشتمل ہے اپنے ایک مشائخ کے حوالے سے جو ابوالحسن بن المظفر الحافظ سے عبارت ایک حدیث بطور مسند (یعنی راویوں کے سلسلے کے ساتھ) بیان کی ہے، حاکم نے اس حدیث کو نقل کرنے کے بعد محمد بن المظفر کی امانت داری، وسیع معلومات اور ثقہ ہونے کو "وھو عندنا ثقۃ مأمون" کہہ کر مہر لگائی ہے۔

حدیث کا متن جو جناب رسالت مآب صلّی اللہ علیہ وآلہ وسلّم سے منقول ہے، اس طرح ہے:

"أتانی ملک فقال یا محمد، وسل[1] من أرسلنا من قبلک من رسلنا علی ما بعثوا؟ قال: قلت: علی ما بعثوا؟ قال: علی ولایتک و ولایۃ علی بن ابی طالب۔

ترجمہ:

میرے پاس ایک فرشتہ آیا اور اللہ کی جانب سے کہا: اے محمد، پوچھو، ان پیغمبروں کے بارے میں جنھیں ہم نے تم سے پہلے بھیجا کہ وہ کس بنیاد اور کس شرط پر مبعوث ہوئے؟ میں نے کہا: کس شرط پر مبعوث ہوئے؟ فرشتہ نے خدا کے قول سے فرمایا: آپ کی اور علیؑ بن ابی طالب صلوات اللہ علیہما و آلہما کے اقرارِ ولایت کی شرط پر۔

ہاں۔ کیوں نہیں، انبیاء ان دونوں ہستیوں کی ولایت کے اقرار کے نتیجے میں نبی ہوئے اور اس میں بہت سے راز اور بہت سی باتیں مضمر ہیں۔

جس طرح کہ رسالت مآبؐ اور امیر المومنین صلوات اللہ علیہما و آلہما کے انوارِ مقدسہ، خدا اور خلق کے درمیان فیضِ وجود کا واسطہ ہیں اسی طرح دیگر فیوض کے باب میں بھی واسطہ رہے ہیں جن میں ایک انبیاء کی نبوت بھی ہے۔ پیغمبر اکرمؐ بہ اعتبار زمانہ اور برحسب

۱: واسئل کا مخفف ہے۔

ظاہر تمام انبیاء میں متأخر لیکن مفہوم کے اعتبار سے برحسب باطن سب پر مقدم ہیں، ابن فارض نے آپ ہی کے قول سے کہا:

وانّی وان کنت ابنِ آدم صورۃ فلی فیہ معنی شاھد بأبوتی

اور "کنت نبیاً وآدم بین الماء والطین" کی مشہور حدیث اسی کی مثال ہے۔

مقصود توئی زجملہ عالم ای مظہر عین اسم اعظم
درحسرت جرعۂ زجامت جان برکف دست می نہد جم
ای آخر انبیا بصورت معنای تو بر ہمہ مقدم
درخلوتِ خاص لی مع اللہ غیر از تو کسی نبود محرم
عیسیٰ نفس از دمِ تو دارد زندہ زتو گشت روح آدم
نقشت بہ خیال می نگاریم ای نور دو چشم اہلِ عالم[1]

مزید کہتے ہیں:

در آئینہ وجود آدم! دیدیم جمال اسمِ اعظم
معنای محمدی بدیدیم در صورت نازنین آدم
دیدیم کہ اوست غیر او نیست ور ہست خیال اوست آنہم
آدم بہ وجود اوست موجود عالم بہ جمال اوست خرم[2]

۱: دیوان: پتھر کی چھپائی والی۔ ص ۴۴۴-۴۴۵

۲: " " " " " " ۴۴۲-۴۴۳

عظیم شاعر حکیم نظامی کہتے ہیں:

ای شاہ سوار ملک ہستی — سلطان خرد بہ چیرہ دستی
ای ختم پیمبرانِ مرسل — حلوای پسین و ملح اوّل [1]

اور یہ ہیں حکیم سنائی:

آدم ازوی پسر بدر گشتہ — وز نجابت در اپسر گشتہ [2]

اور یہ بھی ان ہی کا شعر ہے: ؎

صورت احد ز آدم بدو لیک اندر صفت — آدم از احمد پدید آمد چو ز اصف برخیا [3]

سعدی:

بلند آسمان پیش قدرت خجل — تو مخلوق و آدم ہنوز آب و گل [4]

آپ نے ملاحظہ فرمایا کہ عرفاء اور دانشمندوں نے اس عظیم حقیقت کو نثر و نظم میں کس طرح شیریں الفاظ اور نسیمِ سحر سے زیادہ لطیف جملوں کے غالب میں ڈھالا ہے:

عبارتنا شتّی وحسنک واحد — وکلّ الی ذاک الجمال یشیر

رسولِ اکرم اور امیر المومنین صلوات اللہ علیہما و آلہما اس امت اور دنیا کی دوسری قوموں کے باپ ہیں اور "انا و علی بن ابیطالب

۱: خمسہ نظامی۔ مطبوعہ امیر کبیر۔ ص ۴۳۱۔
۲: حدیقۃ الحقیقۃ مطبوعہ مدرس رضوی ص ۱۹۴۔
۳: دیوان۔ مدرس رضوی۔ ص ۴۴۔
۴: بوستان۔ مطبوعہ فروغی۔ ص ۶۔

ابوا ھذہ الامۃ"[1] کی حدیث اسی مفہوم کی طرف اشارہ ہے:

۱: بحار الانوار ۹/۳۶۔ بحار کے اسی جلد میں صفحہ ۵ پر جناب رسالتمآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے یہ حدیث نقل کی ہے کہ آپنے فرمایا: حق علیؑ، علیٰ ھذہ الامۃ کحق الوالد علی الولد" یعنی حضرت علیؑ کا اُمت پر اسی طرح حق ہے جس طرح ایک باپ کو اپنے بیٹے پر ہے۔ روایات بتاتی ہیں کہ والدین کا عاق کیا ہوا جنت کی بو بھی نہیں سونگھے گا۔ اب آپ خود اس مجمل حدیث سے مفصل تک پہنچیں۔

تبصرہ

اگر اہلِ بیتؑ اطہار کے مخالفین میں سے کوئی کوردل یہ کہے کہ "ابوین" باپ اور ماں یعنی ایک مرد اور ایک عورت پر اطلاق پاتا ہے، دو مردوں کو ابوین نہیں کہتے تو ہم اس کے جواب میں عرض کریں گے کہ تمھاری یہ گفتگو تمھارے جہل اور سیاہ باطن کو ظاہر کرتی ہے کیوں دو مردوں کو ابوین نہیں کہتے؟! سورۂ مبارکہ یوسف کی چھٹی آیت میں خداوندِ عالم ارشاد فرماتا ہے: کما اتمّھا علی ابویک من قبل ابراھیم واسحق" کہ جو بڑی صراحت سے حضرات ابراہیمؑ اور حضرت اسحٰقؑ پر اطلاق پاتا ہے۔

ایک انتہائی لطیف شعر

آپ جانتے ہیں کہ حضرت شاہ ولایت ارواحنافدہ کی ایک کنیت "ابوتراب" بھی ہے۔ عظیم شاعر اور گرانقدر ادیب "عبدالباقی عمری" کہ جن کو عراق کے بعض علماء نے "ادیب العراق علی الاطلاق" کے عنوان سے یاد کیا ہے لفظِ ابوتراب کے سلسلے میں ایک انتہائی لطیف اور مبتکرانہ شعر کہتے ہیں۔ ملاحظہ فرمائیے۔

←

گفت پیغمبر شمارا ای مہان چون پدر ہستم شفیق و مہربان

زان سبب کہ جملہ اجزای مفید جزء را از کل چرا بری کنید

میں نے اپنی گفتگو کے آغاز میں اس بات کی طرف اشارہ کیا تھا کہ جناب رسولِ خداؐ جناب امیر المومنینؑ، حضرت صدیقۂ طاہرہ اور ان کی اولاد سے ائمہ طاہرین صلوات اللہ علیہم کا نور ایک ہی اصل واحد ہے کہ جو مختلف مواطن اور متعدد مظاہر میں ظہور پذیر ہوا۔ یہ ذواتِ مقدسہ واسطۂ فیض علی الاطلاق تھے، ہیں اور رہیں گے اور یہ وساطت کے آثار اپنے اندر انتہا اور آخر نہیں رکھتے اور زیارت جامعہ میں " والرحمۃ الموصولہ " کی عبارت کا یہی مفہوم ہے جو اس طرح ہے۔

«انتم الصراط الأقوم و شهداء دار الفناء و شفعاء دار البقاء والرحمة الموصولة» اس مفہوم کی تائید میں بہت سے دلائل اور بہت سی روایات ہیں اور یہی صورت اسرار کی

يا ابا الأوصياء انت لطه صهره و ابن عمه و اخوه

إنّ الله فى معانيك سراً اكثر العالمين ما علموه

انت ثاني الاباء في منتهى الدو ر و آباؤه تُعد بنوه

خلق الله آدم من تراب فهو ابن له و انت ابوه

دیوان عبدالباقی عمری۔ مطبوعہ نجف اشرف ص ۱۲۶ کہتے ہیں خداوند عالم نے آدمؑ کو مٹی سے خلق کیا پس وہ مٹی کا فرزند ہے اور تم چونکہ ابوتراب ہو اس لئے آدمؑ کے باپ ہو۔

واضح رہے کہ عبدالباقی عمری سنی المذہب ہے اور اس کا نسب تقریباً چالیس واسطوں سے عمر بن خطاب تک پہنچتا ہے۔

بھی ہے جنھیں بغیر تمہید کے بیان نہیں کیا جا سکتا، یہ حقیر تو اس کا اہل نہیں مگر عرض خدمت:

بیکی جرعہ کہ آزار کش در پی نیست
زحمتی می کشم از مردم نادان کہ مپرس

وہ لوگ کہ جو اس طرح کی باتوں کو نہیں سمجھتے ان کے لئے بہتر ہے کہ وہ اسے اسے مطعون کرنے کے بجائے اگر اس قدر رکھتے ہوں تو تحصیل علم اور تطہیر باطن میں اپنی کوششوں کو آگے بڑھائیں اور بہت کم اس بات کا احتمال دیں کہ وہ نہیں جانتے اور کس قدر اپنے آپ کو ملامت کریں۔

تو بتقصیر خود افتادی ازین در محروم
از کہ می نالی و فریاد چرا می داری

قال بعض الأعلام فی شرح قوله علیه السلام: والرحمة الموصولة: «انّ عالم الرّحمة هو عالم الجمع و مرتبة الوجود المطلق من حقیقة النبوّه؛ و لکنّ المراد بها فی هذا المقام بقرنیة توصیفها بوصف الموصولة هو مرتبة الولایة النّوریّة والرحمة الرحیمیّة المکتوبة للمؤمنین الّتی اشار الیها بقوله تعالی: «یا ایها النّاس قد جائتکم موعظة من ربکم و شفاء لما فی الصدور و هدی و رحمة للمؤمنین. قل بفضل الله و برحمته فبذلک فلیفرحوا هو خیر ممّا یجمعون» فی المجمع والجوامع عن الباقر۔ علیه السلام۔: فضل الله: رسول الله۔ صلی الله علیه و آله۔ و

رحمته: علی بن ابی طالب۔ علیه السلام۔ و زاد القمی: فبذلک فلیفرح شیعتنا هو خیر ممّا اعطوا اعدائنا من الذهب والفضّة.» انتهی کلامه رفع مقامه.

قلت: ما رواه۔ قدّس الله سرّه۔ عن الباقر۔ صلوات الله علیه۔ فی تفسیر الفضل والرّحمة؛ هو من باب بیان المصداق؛ فافهم.

نتیجہ اور اختتامی تفسیر

محترم قارئین مجھے اُمید ہے کہ آپ نے انشاء اللہ یہاں تک ان مفاہیم کو بڑی توجہ سے مطالعہ فرمایا ہوگا، اگر یہ بات درست ہے تو آیئے دیکھیں کہ اس عظیم فقیہ اور عارف نے اپنی آخری غزل کے اس آخری شعر میں کیا کہا ہے؟ یا یوں کہوں کہ اس بوڑھے عاشق کے آخری نالہ کا مفہوم کیا ہے؟

معلوم یہ ہوتا ہے کہ "بتکدہ" سے مُراد وہی عالمِ نور یا عالمِ اشباح ہو جسے میں پہلے عرض کر چکا ہوں اور بتا چکا ہوں کہ نور سے خالی عقول ان نکات کو سمجھنے سے قاصر ہیں اور وہاں رکھے ہوئے بُت، معصومین علیہم السّلام کے انوارِ مقدسہ ہوں؟ زیارتِ جامعہ میں ارشاد ہوتا ہے:

«خلقکم الله انواراً فجعلکم بعرشه محدقین»

بینی و بینک فی المودّة نسبة

مستورة عن سرّ هذا العالم

نحن اللّذان تحاببت ارواحنا

من قبل خلق الله طینة آدم

اور "میکدہ" سے مُراد آغازِ خلقت کا مرتبہ ہو، چونکہ ایجاد عالم، محبّت کی بنیاد پر قائم ہے جیساکہ اپنے مقام پر اس کا ذکر آچکا ہے۔ پس عالم پر "میکدہ" کا اطلاق، محبت کی بنیاد پر ایجاد کی طرف کنایہ ہے، چونکہ آغازِ خلقت میں اوّلِ ظاہر اور اوّلِ موجود، حقیقتِ نورِ محمدیؐ ہے جسے حق تعالیٰ نے سب سے پہلے خلق کیا اور حواس کے نزدیک مخلوق میں سب سے زیادہ محبوب اور سب سے زیادہ پسندیدہ ہے اس لئے "بتکدہ" کا اطلاق انہیں پر ہوا ہے۔

شیخ محمد حسن بورینی اور عبدالغنی نابلسی "خمریّۂ فارضیّہ" کی شرح میں جہاں وہ کہتے ہیں۔

شربنا علی ذکر الحبیب مدامة

سکرنا بها من قبل ان یخلق الکرم

<u>لکھتے ہیں</u>: «... انهم یذکرون فی عباراتهم الخمرة بأسمائها و أوصافها و یریدون بها ما أدارالله تعالی علی ألبابهم من المعرفة أومن الشوق؛ والمحبّة والحبیب؛ فی عبارته عبارة عن حضرة الرّسول علیه الصّلاة والسلام؛ و قد یریدون به ذات الخالق القدیم جلّ وعلا؛

لأنّه تعالى أحبّ ان يعرف فخلق؛ فالخلق منه ناشئ عن المحبّة؛ و حيث أحب فخلق، فهو الحبيب والمحبوب، والطالب والمطلوب، المدامة المعرفة الإلهيّة والشوق إليه تعالى؛ و قوله: سكرنا بها؛ أى طربنا و انتشينا على سماع «ألست بربكم» قبل ان يخلق الكرم؛ أى الوجود؛ فإن الكرم عبارة عن هذا الوجود الممكن الحادث الذى اوجدته القدرة الإلهيّة؛ و لاشكّ أن طرب الأرواح على السّماع عند شرب الرّاح قبل ايجاد الأشباح.»[1]

اور "بتِ میکدہ کے ہاتھ سے بیدار ہونے" سے مُراد خوابِ عدم سے بیداری یا حقیقتِ محمدیہ اور معصومین علیہم السّلام کے انوارِ مُقدسہ سے فیض کسب بہ معنای مطلق ہے۔

از رهگذر خاک سرکوی شما بود
هر نافه که در دست نسیم سحر افتاد

السلام عليكم يا اهل بيت النبوه؛ و موضع الرّسالة؛ و مختلف الملائكة؛ و مهبط الوحى؛ و معدن الرّحمة؛ و خزّان العلم و منتهى الحلم؛ و أصول الكرم؛ و قادة الأمم؛ و اولياء النّعم و عناصر الأبرار؛ و دعائم الأخيار؛ وساسة العباد؛ و اركان البلاد؛ و ابواب الايمان، و أمناء الرّحمان؛ و سلالة النّبيين؛ و صفوة المرسلين؛ و خيرة ربّ العالمين و رحمة الله و بركاته.

هذا تمام الكلام فى شرح كلام سيّد الأعلام – قدس الله نفسه الزكيّة. و

۱۔ شرح دیوان۔ مطبوعہ مصر ۲/۱۷۴

سلام علیه یوم ولد و یوم یموت و یوم یبعث حیاً.

تمام شد تسوید این اوراق پریشان در ایام اولین اربعین رحلت جانگداز بنیان گذار جمهوری اسلامی ایران حضرت امام خمینی- قدّس الله لطیفه و اجزل تشریفه-.

و انا الفقیر السید عبدالله الفاطمی ابن العارف بالله تعالی العلم الحجّة الحاج سید اسماعیل الأصفیائی- دام ظلّه- و صلی الله علی سیدنا محمد و آله الطاهرین و علی جمیع انبیائه و رسله و ملائکته و الشهداء و الصّدیقین و سلم تسلیما کثیراً؛ و آخر دعوانا ان الحمد لله ربّ العالمین.

(بدھ ۲۸ تیر (۱۳۶۸ ہجری شمسی) مطابق ۱۵ ذی الحجہ الحرام (۱۴۰۹ ہجری قمری) روزِ ولادت باسعادت مولائے عالم حضرت علی النقی الھادی صلوات اللہ علیہ و علی آبائہ و ابنائہ الطاہرین)

تمام

چشم بیمار

خال لب کا ترے اے دوست گرفتار ہوں میں
چشم بیمار کو دیکھا ہے تو بیمار ہوں میں

کوس انا الحق کا بجایا ہے کہ مثل منصور
اتنا بیخود ہوں، خریدار سردار ہوں میں

غم دلدار نے بھر دی وہ مری روح میں آگ
جاں سے بیزار ہوں اور شہرۂ بازار ہوں میں

وا رہے میرے لیے میکدہ کا در شب و روز
مسجد و مدرسہ دونوں ہی سے بیزار ہوں میں

جامہ زہد و ریا پھینک دیا اور پہنا
خرقہ پیر خرابات تو ہشیار ہوں میں

واعظ شہر کی باتوں نے ستایا جو مجھے
رند میخوار کا اب ہمدم و ہمکار ہوں میں

یاد بتخانہ کروں اب، کہ بت میکدہ نے
خواب سے مجھ کو جگایا ہے تو بیدار ہوں میں